اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

نومبر ۲۰۱۹ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی نئی تالیف

تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت

[تربیتِ طلبہ ہینڈ بک وگائیڈ]

اس سوال کا واضح جواب کہ تعلیمی اداروں میں طلبہ وطالبات کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟

صفحات 160 سائز 20x30x8 قیمت:300 روپے

سکولوں کے لیے خاص رعایت

ملنے کا پتہ

مکتبہ البرھان، A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،

فون نمبر: 0309-4607124

خدمتِ قرآن میں ڈاکٹر محمد امین کا ایک اور منفرد کام

”قرآنی الفاظ کے ترجمے کی بجائے قرآن کی عربی عبارت کے مفہوم کی اردو میں منتقلی“

اسلاف اور جمہور مفسرین کی مطابقت کے ساتھ

رواں، سلیس اور شستہ اسلوب

صرف اردو ترجمہ پڑھیں تو بھی لطف آئے اور بات پوری طرح سمجھ میں آئے

اور تفسیر و حواشی سے بڑی حد تک بے نیاز کرے

پنج سورہ

الفاتحہ، یٰس، الرحمن، الواقعہ، الملک و پارہ عمّ

سفید کاغذ اور مضبوط گتے کی جلد، صفحات ٧٦

ہماری لاگت مع ڈاک خرچ ١٦٠ روپے

ہدیہ: خدمت قرآن میں آپ کو شریک کرنے کے لیے صرف ١٠٠ روپے

بذریعہ: وی پی، منی آرڈر، موبی کیش (اکاؤنٹ نمبر 0306-4640366)

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

❁ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰ صفحات
❁ اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
❁ تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
❁ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
❁ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
❁ تدریس القرآن ① برائے معلمین	۱۹۰
❁ تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات	۷۲
❁ پنج سورہ (اُردو تفہیم، ڈاکٹر محمد امین)	۷۶
❁ ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
❁ نصابِ مدنیؒ	۴۰
❁ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
❁ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
❁ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
❁ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
❁ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
❁ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
❁ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۳

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

مکتبہ البرہان، 97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
0309-4607124

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۳، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۱۹ء/صفر المظفر ۱۴۴۱ھ

مشمولات

○فکر و نظر
لڑائی ۴

○تعلیم و تربیت
- دینی مدارس کی قیادت کی خدمت میں چند گزارشات پروفیسر ملک محمد حسین ۵
- پاکستان میں یونیورسٹی ریسرچ کی حقیقت کیا ہے؟ ڈاکٹر طفیل ہاشمی ۷
- دینی تعلیم میں 'عقیدہ' کی اہمیت مدیر ۸
- کیا کتبِ تزکیہ (وتصوف) کو جزوِ نصاب ہونا چاہیے؟ ۹
- والدین بچے کی تربیت کیسے کریں؟ ادارہ ۱۲
- تعلیم میں ظلم اور بے حیائی (ایم اے او کالج کا واقعہ) پروفیسر ملک محمد حسین ۱۳
- فِن لینڈ، جاپان اور پاکستان کا نظامِ تعلیم ادارہ ۱۶
- پاکستانی والدین غفلت کی نیند سے کب جاگیں گے؟ محمد ندیم اعوان ۱۹
- پاکستان میں جدید عصری تعلیم تباہی کے دہانے پر ڈاکٹر طفیل ہاشمی ۲۶

○میڈیا
- سوشل میڈیا، فتنۂ الحاد اور ہماری نئی نسل مولانا مفتی محمد تقی عثمانی ۲۸
- تجدد اور میڈیا محمد دین جوہر ۳۱

○عالم اسلام
چین میں مسلمانوں پر مظالم کا آنکھوں دیکھا حال (۲) ڈاکٹر شفیق انجم ۳۲

○ملی مجلس شرعی
- ملی مجلس شرعی کے اہم فیصلے ادارہ ۳۷
- تمام دینی مکاتب فکر کا متفقہ فیصلہ۔ جاوید غامدی کے نظریات گمراہ کن ہیں ۳۹

○تفہیم مغرب
اصطلاحات کی حقیقت وحیثیت کو سمجھنا ضروری ہے مفتی علی عمران قادری ۴۶

○پاکستانیات
- عمران خاں کیوں ناکام ہو رہا ہے؟ مدیر ۵۴
- مسئلہ کشمیر کا صحیح حل۔ کشمیری جہاد کریں ۵۵
- دینی قوتیں۔ ہوشیار باش پروفیسر طارق بٹ ۵۶

○مدیر کے نام
کس قیامت کے یہ نامے مدیر ۵۸

فکر و نظر

لڑائی

اور مَیں نے اپنے نفس (امارہ) سے کہا: دیکھ، سدھر جا، مَیں تجھے پامال کر کے رہوں گا، مَیں نے اخلاص فی اللہ کا تہیہ کرلیا ہے۔ اب مَیں تیری کوئی نہیں سنوں گا۔

ابلیس نفس نے کہا: جا، جا، مَیں نے بہت دیکھے ہیں تیرے جیسے کچے پکے ارادے والے

- جو دکھاوا زہد کا کرتے ہیں، اندر سے ریاکار ہوتے ہیں
- ماتھے پر گِٹّا پڑا ہوتا ہے اور جھوٹ بولتے ہیں
- بات رزقِ کفاف کی کرتے ہیں اور دل حرص و ہوس سے بھرا ہوتا ہے
- نام اسلام کے لیے جدوجہد کا لیتے ہیں اور دل حُبّ دنیا اور حُبّ جاہ سے معمور ہوتا ہے

مَیں نے کہا: دفع دور، لعین۔ اپنے پاس رکھ یہ طنز و تشنیع اور طعنے

اس نے کہا: بس، اتنے سے گھبرا گئے! ابھی تو مَیں نے تمھیں تمھارا اندر کا چہرہ پوری طرح دکھایا ہی نہیں۔

یہ لڑائی ازل سے جاری ہے، ابد تک جاری رہے گی

اے اللہ جی! شیطان کی چالوں سے حفاظت فرمایے، اپنی نصرت سے نوازیے

البرہان کا آن لائن مطالعہ کیجیے www.alburhanmonthly.org

تعلیم و تربیت		پروفیسر ملک محمد حسین

'اتحاد تنظیماتِ مدارسِ دینیہ' کے اربابِ حل وعقد کی خدمت میں چند گزارشات

تحریک انصاف کی موجودہ حکومت یکساں نظامِ تعلیم کے نعرے کے ساتھ اقتدار میں آئی ہے۔ یکساں نظامِ تعلیم کے سلوگن کے تحت ہدف زیادہ تر دینی مدارس ہیں حالانکہ پرائیویٹ سکولوں کے بڑے بڑے برینڈز مثال کے طور پر بیکن ہاؤس سکولز، سٹی سکولز، الائیڈ سکولز، دی ایجوکیٹرز وغیرہ اور پھر ان کے ساتھ آرمی پبلک سکولز، فوجی فاؤنڈیشن سکولز اور دیگر حکومتی اور نیم حکومتی اداروں کے سلسلے یکساں نظام تعلیم، یکساں نصاب اور قومی دھارے کی دھجیاں بکھیرنے میں پیش پیش ہیں۔ حکومت کی موجودہ قوت اور اہلیت کو دیکھتے ہوئے نظر نہیں آتا کہ یہ یکساں نصاب اور یکساں نظامِ تعلیم کی پالیسی پر عمل کرا سکے گی۔ سطورِ بالا میں ہم نے جن قومی دھارے سے انحرافی سکول سلسلوں کا ذکر کیا ہے وہ اتنے طاقت ور ہیں کہ ان کے پٹھوں پر ہاتھ رکھنا عمران خان کی حکومت کے بس میں نہیں ہوگا۔ اگر حکومت بفرضِ محال یکساں نظامِ تعلیم کا اپنا خواب پورا کر بھی لیتی ہے تو دینی مدارس اور ان کی تنظیمات کو خم ٹھونک کر درج ذیل مطالبات کو منظور کرنے پر زور دینا چاہیے:

۱۔ یکساں نصاب، یکساں نظامِ امتحان اور یکسانیت کے دیگر پہلو پاکستان کی جغرافیائی حدود میں واقع تمام تعلیمی اداروں پر یکساں نافذ ہوں گے اور اس سلسلہ میں صرف دینی مدارس کو ہدف نہیں بنایا جائے گا۔ بصورت دیگر دینی مدارس بھی اپنی مرضی کا نظامِ تعلیم اور نصاب اختیار کرنے میں آزاد ہوں گے۔

۲۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کو بیرونی نصاب، بیرونی درسی کتب اور بیرونی امتحان اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

۳۔ میٹرک تک تمام تعلیمی اداروں کے لیے اردو ذریعۂ تعلیم لازمی ہوگا اور میٹرک کا امتحان بھی صرف اور صرف اردو میں ہوگا۔

۴۔ اسلامیات کا لازمی نصاب پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک کے لیے لازمی اور ''اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ'' سے منظور کرایا جائے گا یہ نصاب ایسا ہوگا۔ جو آئین کے آرٹیکل ۱۳۱ کے تقاضے کما حقہ پورے کرے گا اور وہی نصاب وزارتِ تعلیم نوٹیفائی کرے گی۔

۵۔ پہلی سے بارہویں تک مختلف مضامین کے نصاب کی تشکیل کے لیے جو کمیٹیاں بنائی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک میں پانچوں ''تنظیمات مدارس دینیہ'' کا ایک ایک نمائندہ شامل ہوگا ورنہ تنظیمات مدارس دینیہ ان کی شرکت کے بغیر بنایا گیا نصاب قبول نہیں کریں گی۔

۶۔ دسویں جماعت تک دینی اور عصری اداروں کے لیے یکساں نصاب ہوگا۔ اس کے بعد طلبا اپنی پسند کا گروپ یعنی پری میڈیکل گروپ، پری انجینئرنگ گروپ، کامرس گروپ، ٹیکنیکل گروپ، علومِ اسلامیہ گروپ وغیرہ رکھ سکیں گے۔

۷۔ میٹرک کے بعد دینی مدارس کی چھ سال کی تعلیم عصری اداروں کے بی ایس (۴ سالہ پروگرام) کے مساوی شمار ہوگی اور دینی اداروں کی مزید دو سال کی تعلیم جو تخصص فی الفقہ، تخصص فی التفسیر، تخصص فی الحدیث وغیرہ پر مشتمل ہو سکتی ہے وہ ایم ایس/ ایم فل کے مساوی شمار ہوگی۔

۸۔ دینی مدارس کے میٹرک کے بعد آٹھ سالہ تعلیم کے حامل طلبہ کسی بھی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کے اہل شمار ہوں گے۔

۹۔ دینی مدارس میں عربی، اُردو کی تعلیم لازمی ہوگی ہی ساتھ عصری اداروں کے بی ایس کورسز کے مطابق انگریزی وسماجی علوم کی تعلیم بھی دی جائے گی۔

۱۰۔ دینی مدارس کے ۱۶ سال یا ۱۸ سال کی تعلیم کے حامل خواتین وحضرات انتظامی اور تعلیمی اسامیوں کے مقابلے کے امتحانات میں بیٹھنے کے اہل ہوں گے اور امتحانات میں شامل مضامین میں دینی مدارس کے مضامین بھی شامل کر لیے جائیں گے۔

اور آخری بات یہ کہ نیشنل کری کولم کونسل میں دینی مدارس کی پانچوں تنظیمات کے سربراہان یا ان کے نمائندے بطور ممبر شامل کیے جائیں گے۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر طفیل ہاشمی

جائز و ناجائز ہر طریقے سے ریسرچ پیپرز لکھنے اور چھپوانے کا بخار

پاکستان میں یونیورسٹی ریسرچ کی حقیقت کیا ہے؟

ایچ ای سی کو اپنی پالیسی بدلنی چاہیے

ایک خاتون جو قائداعظم یونیورسٹی سے تازہ تازہ پی ایچ ڈی تھیں، ایک دوسری یونیورسٹی میں جاب کے لیے انٹرویو دینے آئیں تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے (۸۵) پچاسی ریسرچ پیپرز امپیکٹ فیکٹر جرنلز میں چھپ چکے ہیں۔ اس کے بعد یہ کہانی ہر جگہ نظر آتی رہی۔ ایچ ای سی کی پروموشن پالیسی کے تحت ٹیچنگ کی بجائے ریسرچ کو اہمیت ملنے لگی۔ ہر مضمون کے اساتذہ نے کئی کئی گروپ بنا لیے اور مشترکہ پبلیکیشنز کا سیلاب اُمڈ آیا۔ جو دراصل کیا تھا؟ آپ کسی ڈھابے پر کھانا کھانے جائیں تو کیا پکا ہے؟ پوچھنے پر ویٹر آپ کو آٹھ دس ہانڈیاں گنوا دے گا جو اصل میں دو تین ہی ہوتی ہیں لیکن ان کو مختلف انداز سے مکس کرنے سے کئی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ریسرچ پیپرز کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ یونیورسٹیاں ریسرچ مجلّات نکالنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگ گئیں، جس سے سب کا بھلا ہوتا تھا۔ جب ساری توانائی پیپرز چھپوانے پر لگے گی تو پڑھانے کے لیے پڑھنے کا وقت ہی کہاں بچتا ہے۔ مزید یہ ہوا کہ اساتذہ نے طلبہ کے کاموں پر اپنے نام چھپوا کر اپنی تحقیقات کی تعداد بڑھانے کا بیڑا اٹھالیا۔ چلیں اگر آپ کی نگرانی میں کسی طالب علم نے کوئی کام کیا اور وہ طالب علم فرسٹ آتھر کے طور پر سامنے آتا ہے تو بھی گوارا ہے لیکن طالب علم کے کام کو استاذ اپنے نام سے شائع کروا دیتا ہے یا خود فرسٹ آتھر ہو جاتا ہے، جس پر کوئی کاروائی ہوتی ہے نہ احتجاج۔

اب جبکہ ہائر ایجوکیشن کمشن نے ریسرچ گرانٹ بند کر دی ہے تو کچھ یونیورسٹیز مقالات چھپوانے والوں سے قیمت وصول کرتی ہیں، جس سے مدیران مجلّات کے وارے نیارے ہو گئے ہیں کہ وہ یونیورسٹی فیس کے علاوہ ذاتی نذرانہ بھی وصول کرتے ہیں۔[بعض پروفیسرز نے اپنے شعبہ کے جرنل کو ایچ ای سی سے منظور کرانے کی بجائے اپنے ذاتی جرنلز ایچ ای سی سے منظور کرا کر ریسرچ پیپر چھپوانے والوں سے بھاری فیسیں وصول کرنا شروع کر دی ہیں کیونکہ ایچ ای سی نے پی ایچ ڈی تھیسیز جمع کروانے سے پہلے ایک ریسرچ پیپر کی اشاعت کی شرط رکھ دی ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۱)

تعلیم و تربیت مدیر

دینی تعلیم میں 'عقیدہ' کی اہمیت

دینی مدارس اور سکولوں میں عقیدہ کی تدریس کا منہج ناقص ہے اور قابلِ اصلاح ہے

البرہان کے پچھلے شمارے میں ہم نے کراچی کے مدرسہ دارِ ارقم کے استفسار پر جو نصابی اسکیم تجویز کی تھی اس پر اسلام آباد سے ہمارے دوست محمد خاں منہاس صاحب نے سخت تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بنیادی چیز 'عقیدہ' ہے اور آپ نے اپنی تجویز میں عقیدے کو شامل ہی نہیں کیا!

منہاس صاحب کی بات میں وزن ہے اور ہم خود اس کے قائل بلکہ علمبردار ہیں کیونکہ جب ہم تعلیم وتربیت، دعوت واصلاح اور تزکیۂ نفس پر اصرار کرتے ہیں اور معاشرے وریاست کی اصلاح پر فرد کی تعمیر شخصیت وکردار کو اولیت دیتے ہیں تو ظاہر ہے فرد کی تعمیر شخصیت کی بنیاد ہی ایمانیات اور صحیح عقیدہ پر ہوتی ہے لہٰذا عقیدے کا صحیح ہونا، اس کا جزوِ نصاب ہونا اور اس کی تعلیم وتدریس ایک بنیادی ضرورت ہے جس سے صَرفِ نظر ممکن نہیں۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں چونکہ 'مسلک' نے 'دین' کی جگہ لے لی ہے لہٰذا اگر عقیدے کو جزوِ نصاب بنایا جائے تو حنفی دیوبندی، حنفی بریلوی، اہلِ حدیث، جماعتِ اسلامی اور اہل تشیع سب کے ہاں اس کا مواد مختلف ہوگا جو فرقہ واریت کے فروغ کا سبب بنے گا۔

عقیدہ کی تدریس کا اسلوب بھی ایک اہم مسئلہ ہے جس کے کئی پہلو ہیں مثلاً:

۱۔ اساسات زیرِ بحث لانے کی بجائے فروعات میں گھسا جاتا ہے اور نان ایشوز کو اشوز بنایا جاتا ہے اور اسے اپنے مسلک کے لیے مابہ امتیاز سمجھا جاتا ہے مثلاً توحید، رسالت، آخرت کی بنیادی باتوں کو سمجھنے کی اور ان پر عمل کرنے کی بجائے یہ بات زیرِ بحث آئے گی کہ اللہ کے سوا دوسروں سے خصوصاً فوت شدہ بزرگوں سے استعانت جائز ہے یا نہیں؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قبر میں زندہ ہیں یا نہیں؟ وہ نور تھے یا بشر؟ جمعرات کو روحیں واپس آتی ہیں یا نہیں؟ میلاد منانا جائز ہے یا نہیں؟ وغیرہ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۵)

تعلیم و تربیت مدیر

کیا کتبِ تزکیہ (وتصوف) کو جزوِ نصاب ہونا چاہیے؟

ہماری ایک ذہین قاریہ نے جھنگ سے ہماری توجہ ڈاکٹر طاہر رضا بخاری (ڈائریکٹر جنرل مذہبی امور محکمہ اوقاف، حکومت پنجاب) کے روزنامہ 'دنیا' لاہور میں ان کے ۱۵ جولائی ۲۰۱۹ء کے کالم ''محراب'' کی طرف مبذول کرائی ہے جس کا عنوان ''مدرسہ ایجوکیشن۔ چند فکری زاویے'' ہے اور جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ملا نظام الدین سہالویؒ کے مرتب کردہ درس نظامی سے پہلے جتنے بھی دینی نصاب مسلم ہندوستان میں رائج تھے، ان میں کتبِ تصوف دینی مدارس کے نصاب کا حصہ تھیں لیکن مُلّا صاحب نے نہ جانے کیوں انہیں نصاب میں شامل نہ کیا؟ انہوں نے اس پر بھی حیرت کا اظہار کیا کہ درسِ نظامی کی وہ صورت جو دیوبند نے اختیار کی اس میں بھی اس کے مرتبین نے کتب تصوف کو شامل نہ کیا حالانکہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھنے والے اکثر بزرگ باقاعدہ صوفی تھے یعنی ان کی خانقاہیں تھیں اور مریدوں کا حلقہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہے کہ کتبِ تصوف دینی تعلیم کا حصہ ہونا چاہئیں۔

مسلم ماہرین تعلیم میں اس امر میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ تعلیم کا لازمی نتیجہ تربیت اور تزکیۂ نفس ہونا چاہیے لیکن اس بارے میں ان میں اختلاف ہے کہ اس کے لیے نصابی کتب ہونی چائیں یا نہیں؟ یہ غالباً بیس سال پہلے کی بات ہے کہ ہم نے دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کے لیے کچھ پروگرام شروع کیے تو ہم نے اس کے لیے نصاب کا ایک مسودہ تیار کیا اور اس پر مشاورت کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تربیت اساتذہ (Institute of Education and Research = IER) میں تربیتِ اساتذہ کے دین دار پروفیسروں کے ساتھ ایک نشست رکھی۔ ہماری ایک تجویز یہ تھی کہ اساتذہ کی تربیت وتزکیۂ نفس کے لیے باقاعدہ کورس اور پریڈ ہو اور اس کے ۱۰۰ نمبر رکھے جائیں۔ اُس وقت انسٹی ٹیوٹ میں اسلامی اور فنی حوالے سے ایک مضبوط شخصیت ڈاکٹر مشتاق الرحمن صدیقی صاحب کی تھی (ڈاکٹر صاحب اب ضعیف ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت عاجلہ ودائمہ سے نوازے) انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ میں نے ان سے کہا کہ تدریس اور تربیت میں اہمیت کے لحاظ سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟ کہنے لگے کیوں نہیں؟ تربیت کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی تدریس کی۔ میں

نے کہا یعنی ۵۰، ۵۰۔ کہنے لگے ہاں، میں نے کہا، پھر تو تربیت کے ۸۰۰ میں سے ۴۰۰ نمبر ہونے چاہئیں اور نصابی کتب بھی ہونی چاہئیں۔ کہنے لگے: نہیں۔ تربیت تعلیم ہی کا نتیجہ ہونی چاہیے۔ استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم اس طرح دے کہ اس کے نتیجے میں تربیت بھی ہو۔

ہمارا مطلب یہ ہے کہ بعض اہل علم سمجھتے ہیں کہ تربیت ہونی چاہیے لیکن اس کے لیے باقاعدہ درسی کتب کی ضرورت نہیں۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ تزکیہ وتربیت کے لیے باقاعدہ کورس اور کتابیں ہونی چاہئیں۔ ہم اس دوسرے موقف کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ پہلی اپروچ کے مطابق اگر استاد تعلیم اس طرح نہ دے کہ طالب علم کی تربیت بھی ہو تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تربیت کا عنصر غائب ہوجائے گا۔ دوسری صورت میں کم از کم تزکیہ وتربیت زیر بحث تو آئے گی۔ استاد اور طالب علم اس موضوع پر گفتگو تو کریں گے، سوال وجواب تو ہوں گے۔ طلبہ امتحان پاس کرنے کے لیے ہی سہی، متعلقہ کتب پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش تو کریں گے۔ یوں تربیت وتزکیہ کے حوالے سے کچھ سرگرمیاں وجود میں آئیں گی جبکہ پہلی صورت میں اگر استاد اس موضوع کو اہمیت نہ دے تو معاملہ ختم، کچھ بھی نہیں ہوگا۔

یہ رائے دینے کے بعد کہ تزکیہ وتربیت کو جزوِ نصاب ہونا چاہیے، ہمیں یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ اس کام کے لیے موزوں نصابی کتب موجود نہیں ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں نے تزکیہ وتربیت کے لیے 'تصوف' کے نام سے جو ادارہ بنایا تھا، اس میں بتدریج غیر اسلامی افکار اور غیر شرعی رسوم ورواج شامل ہوتے گئے اور وہ انحطاط کی اس کیفیت کو پہنچا کہ اقبالؒ اور سید مودودیؒ کی طرح بہت سے اہل علم اسے مسلمانوں کے زوال کا سبب سمجھتے ہیں۔ پھر دو صدیوں کی غلامی اور مغرب کی ملحدانہ، مادہ پرستانہ اور عقل پرستانہ لیکن دنیا پر غالب تہذیب نے جس طرح کی ذہنیت کو جنم دیا ہے اس کے پیش نظر ماضی میں تصوف پر لکھی گئی اکثر کتابیں آج کے مائنڈ سیٹ رکھنے والے انسان کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ لہٰذا تزکیہ وتربیت کو شامل نصاب بھی کرنا چاہیے اور اس کے لیے موزوں نئی کتابیں بھی لکھی جانی چاہئیں۔

یونیورسٹی میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اگر کسی نئے موضوع پر کورس متعارف کرائے جائیں تو چند ہی سالوں میں اس موضوع پر کتابیں آنا شروع ہوجاتی ہیں کیونکہ لائق اساتذہ اس نئے موضوع پر سوچنا شروع کردیتے ہیں، مطالعہ کرتے ہیں، نوٹس تیار کرتے ہیں۔ طلبہ کے سوال وجواب ہوتے ہیں، امتحانات ہوتے ہیں اور اس طرح بتدریج اس موضوع پر لٹریچر وجود میں

آنا شروع ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ خواہ دینی مدارس ہوں یا سکول، کالج اور یونیورسٹیاں، ہماری رائے میں ان میں تربیت اور تزکیۂ نفس کا ایک لازمی کورس ہونا چاہیے۔ اس کا نصابی خاکہ بننا چاہیے اور اس کے لیے نئی کتابیں لکھی جانی چاہئیں کیونکہ تزکیۂ نفس حاصلِ تعلیم اور مغزِ دین ہے۔ یہ قرآن وسنت کا بنیادی تقاضا ہے جس سے صَرفِ نظر کرنا بہت غلط اور خطرناک مضمرات کا حامل رویہ ہے۔

خصوصاً تدریب المعلمین کے اداروں میں تو تربیت اور تزکیۂ نفس کے لیے دوہرا نصاب یا دو کورس ہونے چاہئیں۔ ایک اساتذہ کے لیے کہ وہ خود اچھے مسلمان کیسے بنیں کیونکہ جب تک وہ خود اچھے مسلمان نہیں بنیں گے، اپنے طلبہ کو کیسے بنائیں گے؟ اور دوسرا کورس اس موضوع پر کہ وہ طلبہ کو اچھا مسلمان کیسے بنائیں؟ اس سلسلے میں ہم نے کچھ ابتدائی کام کیا ہے اور تعلیمی اداروں میں اسلامی تناظر میں طلبہ کی تعمیر شخصیت وکردار کے لیے دو کتابیں لکھی ہیں جو مزید کام کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "تعلیمی ادارے اور کردار سازی" اور دوسری کا عنوان ہے "تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ تربیت طلبہ ہینڈ بک وگائیڈ"۔

ہم یہ بھی واضح کرتے چلیں کہ طلبہ کے لیے تعمیر شخصیت وکردار، تزکیۂ نفس اور تربیت کے لیے کورس ڈیزائن کرنے اور کتب مرتب کرنے کے لیے ایسے فرد یا افراد کی ضرورت ہے جو قرآن وسنت کے ماہر ہوں، ماضی کے تربیتی سرمائے (تصوف) سے بھی واقف ہوں بلکہ اس پر ان کی گہری نظر ہو۔ ساتھ ہی ضروری ہے کہ ایسا شخص جدید علم النفس وفلسفہ اور دانش تہذیبِ حاضر سے واقف ہو اور عصرِ حاضر کے مائنڈ سیٹ اور مقامی سماجی واخلاقی روایات سے بھی نابلد نہ ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متقی ہو اور ماہر تعلیم ہو۔ یہ ساری خصوصیات اگر کسی ایک شخص میں نہ ہوں تو ان صفات کے حامل افراد کو جمع کر کے ان کے علم اور تجربے سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔

بقیہ: پاکستان میں یونیورسٹی ریسرچ کی حقیقت کیا ہے؟

چنانچہ ریسرچ پیپر چھانے کا یہ منافع بخش کاروبار بہت چل نکلا ہے اور ہوشیار لوگ اس سے خوب پیسے کما رہے ہیں۔ رہی کوالٹی تو اس کی پروا کس کو ہے؟ مدیر]۔

اس پس منظر میں ہماری رائے میں ڈاکٹر قبلہ ایاز اور بعض دوسرے اہل علم کی اس رائے میں وزن ہے کہ جب تک ایچ ای سی ڈاکٹر عطاء الرحمن والی ایجوکیشن پالیسی نہیں بدلتی ہماری یونیورسٹیوں کی تعلیمی حالت بہتر نہیں ہوسکتی۔

تعلیم و تربیت ادارہ

والدین بچے کی تربیت کیسے کریں؟

* اپنے بچے سے یہ مت کہیں کہ دیوار پر نقش ونگار بنا کر اسے گندا مت کرو بلکہ کہیں پیپر پر یہ نقش ونگار بناؤ جب بنالو گے تو ہم اسے دیوار، فریج یا تختہ پر سجائیں گے۔

* بچے سے ایسے نہ کہیں کہ نماز پڑھو ورنہ سیدھے جہنم میں جاؤ گے بلکہ کہیں کہ آؤ اکٹھے ایک ساتھ نماز پڑھیں تاکہ ہم جنت میں بھی اکٹھے ہو جائیں۔

* بچے سے یہ نہ کہیں کہ اٹھو اور اپنا کمرہ صاف کرو، کیا جنگل بنا رکھا ہے؟ بلکہ یہ کہیں کہ بیٹا کیا کمرے کی صفائی میں کوئی مدد چاہیے کیوں کہ تم تو ہمیشہ صفائی اور سلیقہ کو پسند رکھتے ہو۔

* بچے سے یہ مت کہیں کہ کھیل کود چھوڑو پڑھائی کرو، پڑھائی بہت اہم ہے بلکہ کہیں کہ اگر آپ نے آج پڑھائی جلدی مکمل کر لی تو میں آپ کے ساتھ کھیلوں گا یا ایسی کسی بھی سرگرمی کا حوالہ دیں جو اسے پسند ہو۔

* بچے سے یہ نہ کہیں اٹھو اور دانت برش کرو، مَیں تمہیں حکم دے رہا ہوں بلکہ کہیں کہ مَیں تم سے بہت خوش ہوں اس لیے کہ تم ہمیشہ میرے کہے بغیر دانت صاف کر لیا کرتے ہو۔

* بچے سے یہ نہ کہیں کہ بائیں کروٹ مت سویا کرو بلکہ کہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھایا ہے کہ ہم دائیں کروٹ سویا کریں۔

* بچے سے مت کہیں کہ چاکلیٹ اس لیے نہ کھایا کرو کہ دانتوں میں کیڑا لگ جائے گا بلکہ کہیں کہ میں نے دن میں ایک بار چاکلیٹ کھانے کی اجازت اس لیے دی ہے کہ میں جانتا ہوں تم بہت سمجھ دار ہو، اپنے دانتوں کی صفائی کا خوب خیال رکھتے ہو۔

* یاد رکھیے کہ ہر ہر لفظ اور ہر کام جو آپ کرتے ہیں وہ بچے کو بے حد متاثر کرتا ہے اور یہ بھی یاد رکھیں کہ آپ کا بچہ آپ کی سیرت و اخلاق بلکہ آپ کا اپنا ہی عکس ہوتا ہے۔

تعلیم و تربیت　　پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیم میں ظلم اور بے حیائی

مخلوط تعلیم، سمسٹر سسٹم اور پرنسپل کے پیدا کردہ اباحت پسندانہ ماحول اور جھوٹے جنسی الزام کی وجہ سے ایم اے او کالج کے ایک لکچرر کی خودکشی

معاشرے میں سرکاری/حکومتی ظلم بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے انارکی، اباحیت، بے راہ روی اور بے چینی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے ہماری بہو بیٹیوں کو بسوں کا کنڈکٹر بنایا گیا، یہ خواتین کی تذلیل کا ایک تکلیف دہ پہلو تھا۔ حد ہے کہ حقوق نسواں کی تنظیمیں، علمائے کرام اور معاشرتی وسماجی رہنما خاموش رہے۔ ہماری بہنوں بیٹیوں کو جنس بازار بنادیا گیا۔ سیلز گرلز کی شکل میں انہیں دکانوں پر لا بٹھایا گیا۔ دفتروں، بنکوں اور اداروں کے فرنٹ آفس صنف نازک کی نزاکتوں سے مزین کیے گئے۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں تو پہلے ہی ہماری بہو بیٹیاں مارکٹنگ کا آلہ کار تھیں اور اب سرکاری تعلیمی اداروں میں بھی مخلوط ماحول کو عام کردیا گیا۔ بوائز سکولوں اور کالجوں میں زنانہ سٹاف اور زنانہ تعلیمی اداروں میں مردانہ سٹاف بٹھادیا گیا۔ بی ایس پروگرامز کے رائج ہونے سے اب کالجوں میں مخلوط تعلیم کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی سمسٹر سسٹم بھی رائج کردیا گیا۔ نتیجہ ایم اے او کالج لاہور میں ایک محترم استاد کی خودکشی کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ جب جذباتی عمر کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ہوں گے، جب سمسٹر سسٹم کی وجہ سے گریڈنگ کا اختیار استاد کے پاس ہوگا، جب اخلاق اور کردار کا جنازہ نکل چکا ہوگا اور جب گریڈوں کی دوڑ اور حرص ہی تعلیمی معیار کا نشان ہوگا تو یا تو استاد ناجائز فائدہ اٹھائے گا اور اپنی عاقبت خراب کرے گا یا پھر طالب علم بلیک میلنگ کرے گی/کرے گا اور استاد کو برہنہ کرکے رکھ دے گا۔ سمسٹر سسٹم تو یونیورسٹی کی سطح پر بھی کئی خرابیوں کا باعث بنتا رہتا تھا اور اب کالج کی سطح پر مخلوط ماحول میں اس کا نفاذ سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں لائے گا۔ مدینہ کی ریاست کا نعرہ لگانے والی حکومت کے لیے اب یہی ایک گندا کام رہ گیا تھا کہ تعلیمی اداروں میں کھلا مخلوط ماحول پیدا کرکے، نوجوان نسل کے اخلاق و کردار کو برباد کیا جائے۔ نوجوان اساتذہ کو ایک ایسی آزمائش میں ڈال دیا جائے کہ وہ زندگی بھر خواری کا یا تو سامنا کریں اور یا خودکشی کرکے راہئ عدم ہوں۔

حیرت اس بات پر ہے کہ دینی سیاسی جماعتیں، طلبہ اور اساتذہ کی اسلامی تنظیمیں اس ظلم

پر خاموش ہیں۔ کوئی شہ رگ کو بچانے کے لیے سرگرداں ہے تو کوئی آزادی کے حصول کے لیے مارچ پر کمر کس چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے میں شر کے خلاف مزاحمت کی ہمت جواب دے چکی ہے۔ وہ جو تعلیمی اداروں میں چھوٹی سی بے اعتدالی پر بے قابو ہو جایا کرتے تھے اب اخلاقی مظالم کی انتہا کے سامنے بھی مہر بلب رہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ حکومت سے پہلے تعلیم کے پرائیویٹ سیکٹر نے وہ سب کچھ کیا ہے جو اب حکومت کرنے جا رہی ہے اور شاید اس لیے کہ پہلے ہی وہ سب حماقتیں خود ہم سے سرزد ہو رہی ہیں جن کا ارتکاب اب سرکاری اداروں میں شروع ہوا ہے۔ اللہ ہم پر رحم کرے جس کے ہم قطعاً سزاوار نہیں ہیں۔

بی اے/ بی ایس سی کے دوسالہ پروگرامز ختم کر کے ایک اور ظلم کیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایسوسی ایٹ ڈگری کا دوسالہ پروگرام سمسٹر سسٹم کے تحت شروع کر کے ایک اور تعلیمی حماقت کی گئی ہے۔ ہمارے معاشرے کی کم از کم ڈیڑھ سوسالہ تعلیمی روایات ہیں جن میں بی اے/ بی ایس سی اور ایم اے/ ایم ایس سی قبولیت کے ساتھ چل رہا تھا۔ ڈگری کالجز اور یونیورسٹیاں سالانہ امتحانوں کے ذریعے ڈگریاں دیتی تھیں۔ اس سے کچھ نہ کچھ معیار تعلیم کا بھرم باقی تھا لیکن ان پروگراموں کو ختم کر کے نیز سالانہ امتحانات کی بجائے سمسٹر سسٹم کو رائج کر کے جہالت اور تعلیمی کرپشن کا دروازہ چوپٹ کھول دیا گیا ہے۔ ہماری تعلیمی روایات ہمارے تعلیمی رویے اور ہمارے اساتذہ اور طلبہ کی اخلاقی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم نئے نئے تجربات کریں۔ مزید یہ کہ پرائیویٹ سیکٹر کے حاوی ہونے سے اور بھی کئی قباحتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ حکومتی کنٹرول ویسے تو بہت زیادہ ہے لیکن اخلاق، کردار کی تشکیل اور تعلیم کے معیار کو بلند رکھنے میں ہمارے ریگولیٹری ادارے بالکل ناکام ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ پیشتر اس کے کہ بہت دیر ہو جائے ہماری معروضات پر غور کیا جائے اور فی الحال کالجز کی سطح پر مخلوط تعلیم اور سمسٹر سسٹم ختم کیا جائے۔

ڈاکٹر محمد امین

جھوٹی طالبہ کو 'قذف' کی سزا دی جائے

قذف سے متعلق آیۂ قرآنیہ [illegible]
شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴ [النور ۲۴: ۴] کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین، محدثین اور فقہاء کی اکثریت

نے یہ رائے دی ہے کہ قذف کا حکم عام ہے اور اس کا اطلاق عورت و مرد پر یکساں ہوگا یعنی جس طرح عورت پر جھوٹے جنسی الزام کی سزا ۸۰ کوڑے ہے، اسی طرح اگر مرد پر جھوٹا الزام لگایا جائے تو اس کی سزا بھی ۸۰ کوڑے ہے۔

ایم اے او کالج کے لیکچرر کی خودکشی اور اس وقت تک مہیا ہونے والی تفصیلات بظاہر یہی بتاتی ہیں کہ طالبہ کا الزام جھوٹا تھا اور اباحت پسندانہ ماحول پرنسپل کا پیدا کردہ تھا۔ حکومت پنجاب نے بھی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔ اگر اس سے بھی یہی ثابت ہو کہ طالبہ نے جھوٹا الزام لگایا تھا تو ہم مرحوم کے ورثا سے درخواست کریں گے کہ وہ طالبہ کے خلاف قذف کا پرچہ درج کرائیں کیونکہ قذف کی سزا ۸۰ کوڑے پاکستان کے قانون میں موجود ہے۔ ہم حکومت پنجاب سے درخواست کریں گے کہ وہ رفاہ عامہ کی خاطر خود مدعی بن کر قذف کا پرچہ درج کرائے۔ اساتذہ تنظیموں سے بھی ہم درخواست کریں گے کہ وہ طالبہ کو قذف کی سزا دینے اور پرنسپل کی تادیب کا مطالبہ کریں تا کہ آج جو ایک استاد کے ساتھ ہوا ہے وہ آئندہ کسی دوسرے استاد کے ساتھ نہ ہو۔

بقیہ: دینی تعلیم میں 'عقیدہ' کی اہمیت

۲۔ سکولوں میں اسلامیات کا نصاب مختصر اور غیر موثر ہے جبکہ دینی مدارس میں عام طور پر عقیدہ طحاویہ پڑھایا جاتا ہے جو کلامی انداز کا ایک بے روح عقلی بیانیہ ہے۔

۳۔ عقیدہ کی تدریس سے مقصود محض صحیح عقائد کی معرفت اور ان کا جان لینا نہیں ہے بلکہ اس معرفت کا پختہ ایمان میں تبدیل ہونا اور اس پختہ ایمان کا محرکِ عمل بننا ہے تا کہ اس کا نتیجہ اعمالِ صالحہ کی صورت میں نکلے۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن حکیم ''تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس'' سے تعبیر کرتا ہے۔

ہم نے جو نصاب مدرسہ دارِ ارقم کو تجویز کیا تھا اس کی معنویت یہی تھی کہ اس میں مرکزی حیثیت تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کو دی گئی تھی۔ یعنی طلبہ کو قرآن وسنت سے وابستہ کرنا اور ان کے تزکیۂ علم و عمل کے لیے شعوری کوششیں کرنا۔ آدمی قرآن وسنت سے براہ راست مربوط ہو جائے تو اس کا عقیدہ درست بھی ہو جاتا ہے اور وہ محرک عمل بھی بنتا ہے۔ بعض لوگوں کا تصورِ دین ایسا ہے کہ انہیں یہ معنویت اول تو نظر ہی نہیں آتی اور آ بھی جائے تو وہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جبکہ ہمارے نزدیک وہ مغزِ دین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے بنا بنایا نصاب موجود نہیں اور اس کے لیے صحیح رخ پر نئی نصابی کتب مدون کرنا گزیر ہے۔

تعلیم و تربیت ادارہ

ایک تقابلی مطالعہ

فِن لینڈ، جاپان اور پاکستان کا نظامِ تعلیم

رٹّا سسٹم ہمیں تباہ کر رہا ہے جس کی بڑی وجہ انگلش میڈیم ہے

شمالی یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک فِن لینڈ بھی ہے جو رقبے کے لحاظ سے 65 ویں اور آبادی کے اعتبار سے دنیا میں 114 ویں نمبر پر ہے۔ ملک کی کل آبادی 55 لاکھ کے لگ بھگ ہے لیکن آپ کمال دیکھیں اس وقت تعلیمی درجہ بندی کے اعتبار سے فِن لینڈ پہلے نمبر پر ہے جبکہ" سپر پاور" امریکا 20 ویں نمبر پر ہے۔

2020ء تک فِن لینڈ دنیا کا واحد ملک ہوگا جہاں مضمون (سبجیکٹ) نام کی کوئی چیز اسکولوں میں نہیں پائی جائے گی۔ فِن لینڈ کا کوئی بھی اسکول زیادہ سے زیادہ 195 بچوں پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ 19 بچوں پر ایک ٹیچر۔ دنیا میں سب سے لمبی بریک بھی فِن لینڈ میں ہی ہوتی ہے۔ بچے اپنے اسکول ٹائم کا 75 منٹ بریک میں گزارتے ہیں، دوسرے نمبر پر 57 منٹ کی بریک نیو یارک کے اسکولوں میں ہوتی ہے جبکہ ہمارے یہاں اگر والدین کو پتہ چل جائے کہ کوئی اسکول بچوں کو" پڑھانے" کی بجائے اتنی لمبی بریک دیتا ہے تو وہ اگلے دن ہی بچے اسکول سے نکلوالیں۔

خیر، آپ دلچسپ بات ملاحظہ کریں کہ پورے ہفتے میں اسکولوں میں محض 20 گھنٹے " پڑھائی" ہوتی ہے جبکہ اساتذہ کے 2 گھنٹے روز اپنی" اسکلز" بڑھانے پر صَرف ہوتے ہیں۔ فِن لینڈ میں ٹیچر بننا ڈاکٹر اور انجینئر بننے سے زیادہ مشکل اور اعزاز کی بات ہے۔ پورے ملک کی یونیورسٹیز کے" ٹاپ ٹین" ماسٹرز کیے ہوئے طالبعلموں کو ایک خصوصی امتحان کے بعد اسکولوں میں بطور استاد رکھا جاتا ہے۔ سات سال سے پہلے بچوں کے لیے پورے ملک میں کوئی اسکول نہیں ہے اور پندرہ سال سے پہلے کسی بھی قسم کا کوئی باقاعدہ امتحان بھی نہیں ہے کہ جس میں ماں باپ بچے کی نیندیں حرام کردیں۔ ان کے کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے پر پابندی لگ جائے، دروازے کھڑکیاں بند کرکے انہیں گھروں میں" نظر بند" کردیا جائے۔ گھر میں آنے

والے مہمانوں سے ملنے تک پر پابندی عائد کردی جائے اور گھر میں مارشل لاء اور کرفیو کا سا سماں بندھ جائے۔ پورے ملک میں تمام طلبہ و طالبات کے لیے ایک ہی امتحان ہوتا ہے۔ ریاضی کے ایک استاد سے پوچھا گیا کہ آپ بچوں کو کیا سکھاتے ہیں تو وہ مسکراتے ہوئے بولے " میں بچوں کو خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنا سکھاتا ہوں کیونکہ اس طرح وہ زندگی کے ہر سوال کو باآسانی حل کر سکتے ہیں"۔

آپ جاپان کی مثال لے لیں۔ تیسری جماعت تک بچوں کو ایک ہی مضمون سکھایا جاتا ہے اور وہ " اخلاقیات" اور" آداب" ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا" جس میں ادب نہیں اس میں دین نہیں"۔ ہمیں نہیں معلوم کہ جاپان والے حضرت علیؓ کو کیسے جانتے ہیں اور ہمیں ابھی تک ان کی یہ بات معلوم کیوں نہ ہوسکی۔ بہرحال، اس پر عمل کی ذمہ داری فی الحال جاپان والوں نے لی ہوئی ہے۔ ہمارے ایک دوست جاپان گئے اور ایئرپورٹ پر پہنچ کر انہوں نے اپنا تعارف کروایا کہ وہ ایک استاد ہیں اور پھر ان کو لگا کہ شاید وہ جاپان کے وزیراعظم ہیں۔ یہ ہے قوموں کی ترقی اور عروج وزوال کا راز۔

اشفاق احمد صاحب کو ایک دفعہ اٹلی میں عدالت جانا پڑا اور انہوں نے بھی اپنا تعارف کروایا کہ میں استاد ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جج سمیت کورٹ میں موجود تمام لوگ اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ قوموں کی عزت کا راز استادوں کی عزت میں ہے۔ آپ یقین کریں استادوں کو عزت وہی قوم دیتی ہے جو تعلیم کو عزت دیتی ہے اور اپنی آنے والی نسلوں سے پیار کرتی ہے۔ جاپان میں معاشرتی علوم" پڑھائی" نہیں جاتی ہے کیونکہ یہ سکھانے کی چیز ہے اور وہ اپنی نسلوں کو بہت خوبی کے ساتھ معاشرت سکھا رہے ہیں۔ جاپان کے اسکولوں میں صفائی ستھرائی کے لیے بچے اور اساتذہ خود ہی اہتمام کرتے ہیں، صبح آٹھ بجے اسکول آنے کے بعد سے 10 بجے تک پورا اسکول بچوں اور اساتذہ سمیت صفائی میں مشغول رہتا ہے۔

دوسری طرف آپ ہمارا تعلیمی نظام ملاحظہ کریں جو صرف نقل اور چھپائی پر مشتمل ہے۔ ہمارے بچے" پبلشرز" بن چکے ہیں۔ آپ تماشہ دیکھیں جو کتاب میں لکھا ہوتا ہے اساتذہ اسی کو بورڈ پر نقل کرتے ہیں۔ بچے دوبارہ اسی کو کاپی پر چھاپ دیتے ہیں۔ اساتذہ اسی نقل شدہ اور چھپے ہوئے مواد کو امتحان میں دیتے ہیں۔ خود ہی اہم سوالوں پر نشانات لگواتے ہیں اور خود

ہی پیپر بناتے ہیں اور خود ہی اس کو چیک کر کے خود ہی نمبر بھی دے دیتے ہیں، بچے کے پاس یا فیل ہونے کا فیصلہ بھی خود ہی صادر کر دیتے ہیں اور ماں باپ اس نتیجے پر تالیاں بجا بجا کر بچوں کے ذہین اور قابل ہونے کے گن گاتے رہتے ہیں۔ جن کے بچے فیل ہو جاتے ہیں وہ اس نتیجے پر افسوس کرتے رہتے ہیں اور اپنے بچے کو "کوڑھ مغز" اور "کند ذہن" کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔

آپ ایمانداری سے بتائیں اس سب کام میں بچے نے کیا سیکھا، سوائے نقل کرنے اور چھاپنے کے؟ ہم 13، 14 سال تک بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے اسمبلی کرواتے ہیں اور وہ اسکول سے فارغ ہوتے ہی قطار کو توڑ کر اپنا کام کرواتے ہیں۔ جو جتنے بڑے اسکول سے پڑھا ہوتا ہے قطار کو روندتے ہوئے سب سے پہلے اپنا کام کروانے کا ہنر جانتا ہے۔ ہم پہلی سے لے کر دسویں تک اپنے بچوں کو "سوشل اسٹڈیز" پڑھاتے ہیں اور معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ بتانے اور سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ ہم نے کتنا "سوشل" ہونا سیکھا ہے؟ اسکول میں سارا وقت سائنس "رٹتے" گزرتا ہے اور آپ کو پورے ملک میں کوئی "سائنس دان" نامی چیز نظر نہیں آئے گی کیونکہ بدقسمتی سے سائنس "سیکھنے" کی اور خود تجربہ کرنے کی چیز ہے اور ہم اسے بھی "رٹّا" لگواتے ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ ہر جگہ انگلش میڈیم رائج ہے اور اکثر بچوں کو انگلش نہیں آتی۔

آپ حیران ہوں گے میٹرک کا پہلا امتحان 1858ء میں ہوا اور برطانوی حکومت نے یہ طے کیا کہ برصغیر کے لوگ ہماری عقل سے آدھے ہوتے ہیں اس لیے ہمارے ہاں "پاسنگ مارکس" 65 ہیں تو برصغیر والوں کے لیے 32 اعشاریہ 5 ہونے چاہئیں۔ دو سال بعد 1860ء میں اساتذہ کی آسانی کے لیے پاسنگ مارکس 33 کر دیے گئے اور ہم 2019ء میں بھی ان ہی 33 نمبروں سے اپنے بچوں کی ذہانت کو تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اسکولز کے پرنسپل صاحبان اور ذمہ دار اساتذہ کرام سر جوڑ کر بیٹھیں، اس گلے سڑے اور بوسیدہ نظامِ تعلیم کو اٹھا کر پھینکیں، بچوں کو طوطا بنانے کی بجائے قابل بنانے کے بارے میں سوچیں۔ یہ اکیسویں صدی ہے دنیا چاند پر پہنچ رہی ہے اور ہم ابھی تک "رٹّا سسٹم" کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

تعلیم و تربیت　　محمد ندیم اعوان [۱]

ہم اپنے بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں اور انہیں کیا بنا رہے ہیں؟

پاکستانی والدین غفلت کی نیند سے کب جاگیں گے؟

والدین اپنے بچوں کو مہنگی فیس دے کر، انگلش میڈیم سکولوں میں بھجوا کر اور انہیں غیر اسلامی اقدار سکھا کر خود اپنا مستقبل تباہ کر رہے ہیں

عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد جیسے ہی وہ مسجد سے نکلا، اتفاقاً اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ چونکہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے اس لیے احتراماً مَیں نے سلام کرنے میں پہل کی اور مصافحہ کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ حسبِ روایت حال احوال پوچھا اور ہم ایک ساتھ گھر کی طرف چلنے لگے۔ اس سے قبل ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے بعد یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ مسجد سے گھر تک پاپیادہ تقریباً آٹھ سے دس منٹ کا فاصلہ تھا اور یہی فاصلہ بعد ازاں ہماری قربت کا سبب بنا، جس نے مجھے عملی طور بچوں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ اُن کی نفسیات کو مزید گہرائی سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کیا، لیکن ساتھ ہی مجھے اپنے ملک میں رائج فرسودہ طبقاتی نظام تعلیم سے مزید بدظن بلکہ اس مؤقف پر اطمینان قلبی کا سامان فراہم کیا کہ ہمارا طبقاتی نظام تعلیم معاشرے میں فکری تضاد، ذہنی انتشار، بے راہ روی، بے بسی، نا اُمیدی اور نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی علوم وعمرانی علوم کے نام پر افکار وخیالات کو مغرب زدہ، اخلاقیات کو پراگندہ، سفلی جذبات کو برانگیختہ اور انگریزی کے نام پر عریانیت کا درس دیتا ہے۔

ہوا کچھ یوں کہ مسجد سے واپسی پر ہمارے پہلو میں ایک بچہ ''سپائیڈر مَین'' کے ''کاسٹیوم'' میں ملبوس تصوراتی کردار کو حقیقت سمجھ کر عجیب وغریب حرکتوں سے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہا، زبان سے خاص قسم کی آواز کے ساتھ ساتھ وہ ہموار سڑک پر پلٹی مارتا اور چھلانگیں لگاتا لیکن اس بار اُس نے انوکھا کرتب دکھایا اور واقعی ہم اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''حقیقی سپائیڈر مَین'' نے خود کو زمین پر اس شان سے دے مارا کہ وہ دھڑم سے گر گیا اور اُس نے میری توجہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پاپیادہ ہمرکاب کے اوسان بھی خطا کر دیے۔ اُس وقت مجھے علم

[۱] پشاور nts143043@gmail.com

ہوا کہ یہ ''حقیقی سپائیڈر مَین'' اِن صاحب کا لاڈلا ہے۔ بہر حال قصہ مختصر مَیں نے راستے ہی میں انہیں بچوں میں تصوراتی کرداروں کے جنم لینے کے اسباب، سدباب اور نقصانات سے آگاہ کیا اور مزید مطالعہ کے لیے بچوں کی تربیت کے حوالے سے کچھ کتابیں تجویز کیں۔

تقریباً تین ہفتے بعد ان صاحب نے عصر کے وقت میرے گھر کے دروازے پر دستک دی اور بڑی شدت کے ساتھ اپنے بچوں کو پڑھانے پر اصرار کیا۔ یہ مطالبہ یا اصرار حادثاتی، ہنگامی، اتفاقی، یا جذباتی نہیں تھا بلکہ اس دوران کئی بار نشست و برخاست کے ذریعے ہم اپنے خیالات، رجحانات، ذوق اور دلچسپی کے بارے میں تبادلۂ خیال کر چکے تھے چنانچہ بچوں کو پڑھانے کے حوالے سے میرا جواب نفی میں تھا کیونکہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ والدین تعلیمی اداروں کا سارا بوجھ ''ٹیوٹر'' کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں، چاہے وہ لکھنے لکھانے، پڑھنے پڑھانے، یاد کرنے کا کام ہو یا پھر بچوں کی تربیت ہو جس کے عوض اُسے مشاہرہ کے طور پر انتہائی خسیس رقم ہاتھ میں تھما کر اپنے رویے سے اس بات کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے کہ وہ معلم یا ٹیوٹر نہیں بلکہ جیسے ان کا زر خرید غلام ہے۔ لیکن ان صاحب کو شاید کچھ اور ہی مطلوب تھا جس کا وہ کھل کر اظہار نہیں کر پا رہے تھے لیکن میں ان کے مطلوب کو سمجھ چکا تھا۔ بالآخر وہ یوں لب کشا ہوئے ''میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے بچوں کے ساتھ چوبیس گھنٹوں میں ایک مختصر دورانیہ صَرف کریں، اس کے عوض آپ جتنی رقم کا مطالبہ کریں گے میں دینے کے لیے تیار ہوں''۔ اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی، تعلیم و تربیت سے قلبی شغف اور ''شرارتی'' بچوں سے بے پناہ فطری محبت کی وجہ سے مَیں نے معاوضہ و مشاہرہ پر صاحب کی ضرورت اور بچوں کی تربیت کو فوقیت دی اور اس کے لیے مغرب سے عشاء کا وقت مقرر کر لیا۔

پہلے سات دن کھیل کھیل کے ذریعے بچوں کو اپنے ساتھ مانوس کر کے کی کوشش کرتا رہا۔ اگلے ہفتے کی پڑھائی کے لیے بچوں کی ذہن سازی پیش نظر تھی۔ اگلے ہفتے ''اللہ کا نام، محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام اور کلمہ طیبہ'' کے خالی نقوش میں رنگ بھرنے کی مشق کرواتا رہا تا کہ خالق کائنات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات سے شناسائی ہو اور کلمہ طیبہ زبان پر جاری ہو، تا کہ بچوں کی تربیت کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کی جا سکیں۔ تیسرے ہفتے میں سکول کی طرف سے دیے گئے اسباق کو پڑھانے کا آغاز کیا اور یہ آغاز میرے جیسے ''دقیانوسی خیالات'' اور ''قدامت پسند'' شخص کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔

یہ دو بچے تھے، ایک صاحب کی پانچ سالہ بیٹی جو ''پلے گروپ'' میں تھی اور ایک بیٹا جو سات

سال کا تھا، جسے رسمی تعلیم سے قبل ’’ابتدائی انگریزی‘‘ سکھانے کے لیے پہلی جماعت سے قبل کسی درجے میں رکھا گیا تھا۔ میں نے بچے سے اپنا بیگ لانے کو کہا، وہ گیا، اپنا بیگ لایا اور مجھے پکڑا دیا۔ میں نے کھول کر دیکھا تو اس میں پاکٹ سائز سے تھوڑی سی بڑی چند صفحات پر مشتمل ایک کتاب موجود تھی۔ بچے نے کہا ہم سکول میں صرف اسی کو پڑھتے، یاد کرتے اور سمجھتے ہیں۔ جب میں نے چند صفحات پر مشتمل وہ چھوٹی سی کتاب کھولی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، آنکھوں میں تاریکی چھا گئی اور پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ مَیں اس غلاظت سے بھرے مناظر کے مجموعے ’’پاکٹ سائز کتاب‘‘ کو نہ کھولتا تو شاید میرے لیے اس طبقاتی نظام تعلیم میں اسلامی پیوندکاری کی گنجائش باقی رہتی اور آج میرے اندر اُن دانشوروں کے لیے اتنی نفرت نہ بھری ہوتی جو جنسی تعلیم کی آڑ میں معاشرے کو اس مقام پر لاکھڑا کرنا چاہتے ہیں جہاں شرم وحیا عنقا ہو، والدین کا احترام مفقود ہو اور رشتوں کا تقدس ایک فلسفہ بن کر صرف کتابوں میں زندہ رہے۔

اس کتابچے میں ایسا کیا تھا جسے دیکھ کر مجھے ان والدین پر افسوس اور ان کے بچوں پر ترس آنے لگا۔ چلیے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ کتابچے کے صفحہ اول پر ’’ابتدائی انگریزی‘‘ سکھانے کے لیے بمشکل تین چار الفاظ تھے، پہلی سطر میں ’This is Peter‘ یہ (گوروں کا) بچہ پیٹر ہے۔ دوسری سطر میں ’This is Jennifer‘ یہ (گوروں کی) بچی جینیفر ہے۔ تیسری سطر میں ’This is a dog‘ یہ ایک کتا (حیوان نجس) ہے۔ اور آخری سطر میں ’and we are playing‘ اور ہم کھیل رہے ہیں لکھا گیا تھا۔ گویا اس میں مغربی تہذیب کی منظر کشی پوری کامیابی سے کی گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ مغربی تہذیب کی پوری کی پوری داستان بزبانِ حال بچوں کو اپنے اندر جذب ہونے کی دعوت دے رہی تھی۔ تصویر میں جینیفر اور پیٹر کو ’’بیچ‘‘ (Beach) پر ایک ’’کتے‘‘ کے پیچھے دوڑتے دکھایا گیا۔ ’’ساحل سمندر‘‘ کی بجائے ’’بیچ‘‘ لفظ کا استعمال زیادہ مناسب معلوم ہوا تاکہ منظر کے پیچھے چھپے حقائق اور مقاصد کا بآسانی ادراک کیا جاسکے کیونکہ ’’ساحل سمندر‘‘ اور ’’بیچ‘‘ لفظ کے تصور میں بعد المشرقین ہے۔ ’’ساحل سمندر‘‘ کا لفظ عمومیت کا حامل ہے اور خصوصاً ’’فن جغرافیہ‘‘ میں بکثرت اُس وقت استعمال ہوتا ہے جہاں آبی وسائل، محل وقوع یا کسی بندرگاہ وغیرہ کی اہمیت کا تذکرہ مقصود ہو، جبکہ ’’بیچ‘‘ مغربی تہذیب کا اٹوٹ انگ ہے جس سے ذہن میں لہو ولعب، بدکاری اور فحاشی وعریانی کا ایک خاص تصور اُبھرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ بچوں کو اُن ملبوسات میں بھی دکھایا جائے جو ’’بیچ‘‘ کے لیے زیادہ موزوں ہیں تاکہ ایک ہی تصویر سے بچوں کے لاشعور پر مغربی تہذیب کا

پورے کا پورا خاکہ نقش کر دیا جائے چنانچہ تصویر میں پیٹر کو نیکر اور جینیفر کو شارٹ سکرٹ یعنی ٹو پیس پہنے دکھایا گیا تھا۔ بچوں کے ہاتھوں میں تھمائے گئے کتابی شکل میں بے حیائی کے مناظر نے مجھے ایک کے بعد دوسرا ورق پلٹنے پر اور یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ رفتہ رفتہ تھوڑی سی ''مثبت'' ترمیم وتبدیلی کے ساتھ ''ابتدائی انگریزی'' کے ساتھ ساتھ یہ مسلمان بچوں کو مغربی تہذیب کا بپتسمہ دینے کی ایک کامیاب کاوش تھی۔ بالآخر اس مجموعے کی ورق گردانی ختم ہوئی اور میں نے والدین کو ان تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد مَیں نے اُس تعلیمی ادارے سے بھی رابطہ کرنے کا ارادہ کیا تھا تاہم مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ایک غیر متعلق اور غیر معروف شخص ہونے کی وجہ سے وہ ٹس سے مس نہیں ہوں گے۔ بہر حال مَیں نے ان سے بھی رابطہ کیا، سلام دعا کے بعد مَیں نے بڑے سلیقے سے اپنی گزارش ان کے سامنے رکھی اور مسلمان بچوں کو اسلامی تہذیب سکھانے یا پھر کم از کم مغربی تہذیب کا قلادہ بچوں کے گلے میں نہ ڈالنے کی درخواست کی تو ''عالی مقام'' نے میری گزارش اور درخواست دونوں کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ''آج تک تو کسی نے اس کتاب پر اعتراض نہیں کیا۔''

مَیں نے والدین کو متبادل تعلیمی ادارے میں بچوں کو داخل کرانے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی دینی تربیت پر توجہ دینے والے چند اداروں کے نام بھی بتائے تاکہ غلط عوامل بچوں کی تربیت پر اثر انداز نہ ہوں اور ہماری محنت بچوں کی تربیت کی صورت میں ظاہر ہو لیکن والدین کی طرف سے کوئی مثبت ردّعمل نہ ملنے کی صورت میں مَیں نے بچوں کی تعلیم وتربیت کے تسلسل کو منقطع کرنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ جہاں فکری تضاد موجود ہو اور بچوں کی تربیت کا معیار مختلف ہو وہاں اپنی صلاحیتیں اور وقت دونوں صَرف کرنا مترادف از حماقت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ان دونوں نعمتوں کی ناقدری ہے۔

والدین کو آج ہی اس بات کا فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ مستقبل میں اپنے بچوں کو کیسا دیکھنا چاہتے ہیں؟ ہم اپنے بچوں کو حسنؓ، حسینؓ، معاذؓ، معوذؓ، محمد بن قاسمؒ، صلاح الدین ایوبیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بنانا چاہتے ہیں یا پھر ''پیٹر اور جینیفر''۔ جن والدین کی واقعی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بڑے ہو کر ''پیٹر اور جینیفر'' کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ان سے ہمارا کوئی تعرض نہیں، لیکن انہیں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بچوں کا ''پیٹر اور جینیفر'' بن جانا عملی زندگی میں صرف ان کی زندگی تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ وہ دوسروں کی زندگی پر بھی ممکنہ حد تک اثر انداز ہوتے ہیں اور کل کلاں اگر خدانخواستہ زندگی میں آپ کو کبھی بچوں کی ضرورت پڑے یا ان کی کمی کا شدید احساس ہو تو کم از کم آپ ان سے کسی قسم کی خیر خواہی یا صلہ

رحمی کی امید نہ کیجیے گا کیونکہ جن بچوں کی تربیت کے لیے ''پیٹر اور جینیفر'' کا معیار مقرر کیا جاتا ہے ان کی سوچ صرف اپنی ذات تک محدود رہتی ہے اور خود غرضی، نفس پرستی، مفاد پرستی ان کی رگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ البتہ وہ تمام زندگی میں والدین کا ایک صرف ایک حق ادا کرنے کے لیے خود کو پابند سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر آپ نے کبھی ان کی ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے کی بھول کی یا آپ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو وہ آپ کو کسی اولڈ ایج ہوم [1] میں بھیجنے کے لیے دیر نہیں کریں گے۔ لہٰذا والدین کو آج ہی اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل طے کرتے ہوئے تعلیمی ادارے کا انتخاب کرنا چاہیے۔

مجھے اس بات کا بھی بخوبی ادراک ہے کہ میرے ملک کے عظیم دانشور یہ سیکولر اور لبرل حضرات میری ''تنگ نظری'' اور ''دقیانوسی خیالات'' پر لیکچر دینے کے لیے لپک پڑیں گے اور ان تمام کے تمام دانشوروں کے لیکچر کا ابتدائیہ اور اختتامیہ یہی ہوگا کہ ''ارے بھئی! کیوں ایک معمولی چیز کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہو؟ ایک معمولی سی تصویر جس میں بچوں کے لیے تفریح کا سامان فراہم کیا گیا ہے اُسے کیوں اسلام اور کفر کی جنگ میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟ کیا ہے اُس تصویر میں؟ یہ لباس تو عموماً ساری دنیا میں ہر جگہ بچپن میں بچوں کو پہنایا جاتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ثقافتی و قومی لباس میں تبدیل ہو جاتا ہے، لہٰذا اتنا بڑا تماشا کرنے اور ہنگامہ برپا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

کوئی ہے جو ان دانشوروں سے پوچھے کہ موجودہ مغربی تہذیب کی ابتدا کہاں سے اور کیسے ہوئی جو آج بے حیائی کی معراج کو پہنچ چکی ہے۔ جہاں ہر تین منٹ بعد ایک مجبور، بے بس و لاچار عورت مَردوں کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے، جہاں ہر سال عورتوں سے زیادتی کے ہزاروں واقعات ریکارڈ کیے جاتے ہیں اور یہ صرف وہ واقعات ہیں جو قانونی دفعات کے تحت درج کیے جاتے ہیں۔ جو واقعات قانون کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں یا نہیں قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے، وہ تمام اس کے علاوہ ہیں۔ وہ معاشرہ جہاں نابالغ بچیوں کے حاملہ ہونے کی خبریں آئے روز اخبارات کو رونق بخشتی ہیں، جہاں بلوغت تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک لڑکی اپنی بکارت کھو بیٹھتی ہے اور جب اس سے اِس بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ بلا جھجک اس بات کا برملا اظہار کرتی ہے کہ ''قبل از بلوغت مَیں مَردوں کی ہوس'' کا شکار ہو چکی ہوں اور مجھے کوئی عار

---

[1] یاد رہے کہ پاکستان کے بڑے شہروں کراچی، لاہور وغیرہ میں مختلف ناموں سے 'اولڈ ایج ہوم' بن چکے ہیں اور ''تبدیلی سرکار'' کا اعلان آچکا ہے کہ وہ جلد ہر ضلعی ہیڈ کوارٹر میں ایک ''اولڈ ایج ہوم'' بنائے گی۔

اور شرم محسوس کرنے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ ایک کامیاب کیریئر کے لیے یہ سب کچھ کرنا ضروری تھا۔ وہ معاشرہ جہاں ناجائز تعلقات کے نتیجے میں ناجائز اولاد کے ''ابورشن'' کو انسانیت کے ساتھ ''سب سے بڑا ظلم'' اور اُس بچے کی پیدائش کو قانونی تحفظ کے ذریعے لازمی قرار دیا گیا ہو اور ان کی مخصوص تعلیم وتربیت کے لیے سیکڑوں ادارے قائم کیے گئے ہوں، اس لیے نہیں کہ ان لاوارث اور ''ناجائز نسل'' کو جینے کا بنیادی حق دینے کے ساتھ ساتھ تمام انسانی حقوق دیے جائیں، بلکہ اس لیے کہ جوان ہونے کے بعد انہی لوگوں کو ''کرایے کی فوج'' (Contractors) کا حصہ بنا دیا جائے اور دنیا کے امن کو سبوتاژ کرنے کے لیے مختلف ممالک (خصوصاً مسلمان ممالک) پر انہی کے ذریعے جنگوں کو مسلط کر دیا جائے۔ وہ معاشرہ جہاں ''ناجائز'' نام کی کوئی چیز موجود نہ ہو بلکہ وہاں سب کچھ جائز ہو۔ ہاں جی! ''سب کچھ'' البتہ وہ سب کچھ کرنے کے لیے ''قانونی جواز'' کا پروانہ آپ کے پاس ہونا چاہیے۔ لہٰذا میری ''تنگ نظری'' پر ان حضرات کا بھاشن دینا تو لازمی ہے، اس لیے نہیں کہ یہ میرے محسن اور خیر خواہ ہیں اور میرے فکر ونظر کی اصلاح چاہتے ہیں بلکہ اس لیے کہ صوم وصلوۃ کے احکام میں وہ مغرب کے خوشہ چین ہیں اور ''قصر ابیض'' کو ہی اپنا قبلہ مانتے ہیں، اس لیے کہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے انہیں ''واشنگٹن'' کا طواف کرنا پڑتا ہے، زکوۃ (چیریٹی) کے لیے انہیں ''بل اینڈ مٹینڈا'' اور ''یونیسف' سے بہتر کوئی مصرف دکھائی نہیں دیتا۔ یہ کیا جانیں مغربی تہذیب کی منظر کشی کیا ہوتی ہے؟ انہیں کیا پتا مسلمان بچوں کی تربیت کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے؟

کاش! اس پاکٹ سائز کتاب کے صفحات پر پیٹر اور جینیفر کی جگہ عبداللہ اور فاطمہ کا نام لکھا ہوتا، ساحل سمندر یعنی ''بیچ'' کی بجائے کسی کھیل کا میدان، گھر، سکول یا پھر قدرت کی حیران کر دینے والی صناعی کی منظر کشی کی جاتی، کتے کی جگہ اونٹ، گھوڑے یا پھر ہاتھی یا ہرن کو شامل کر لیا جاتا، اور بچوں کو سکرٹ اور نیکر کی بجائے قومی لباس یعنی شلوار قمیص کے ساتھ بچی کے سر پر دوپٹہ اور بچے کے سر پر ٹوپی میں ملبوس دکھایا جاتا تو شاید مجھے ڈھائی ہزار الفاظ لکھنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی اور خوامخواہ اپنے ملک کے ''شریف ترین'' سیکولر اور لبرل دانشور حضرات کو کوسنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن تب بھی معرکہ آرائی ناگزیر تھی، کیونکہ جس طرح ان مناظر کو دیکھنے سے میرا خون کھول اُٹھا، اسی طرح پیش کردہ متبادل مناظر کو دیکھتے ہی یہ سیکولر ولبرل حضرات بھڑک اٹھتے، پہلی فرصت میں مسجد، مولوی، مدرسہ، داڑھی، پگڑی، اسلامی شعائر یہاں تک کہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظام کو مغرب سے خریدے گئے نشتروں کے ذریعے

مجروح کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے بعد ''معیاری نظام تعلیم'' کا علم بلند کر کے ایسی کتابیں چھاپنے والے اداروں کے خلاف اپنے ہم خیال لوگوں کی ایک فوج تشکیل دیتے اور حکومتی ایوانوں کے ذریعے ان اداروں پر پابندی لگوانے کے لیے چڑھ دوڑتے۔ لہٰذا معرکہ آرائی ناگزیر تھی اور یہ معرکہ تب تک جاری رہے گا جب تک دنیا میں دو مدمقابل یعنی حزب اللہ اور حزب الشیطان موجود رہیں گی۔

البرہان

ہم سے بیان کیا برادر مرزا عزیز احمد صاحب نے (جو بفضلہٖ تعالیٰ حیات ہیں اور زندگی بھر تحریک اسلامی سے وابستہ رہے ہیں) کہ مَیں مولانا امین اصلاحی مرحوم کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے نواسے نواسیاں (چھوٹے بچے) سامنے سے گزرے جو نیکر نکٹائی پہنے اور بیگ لٹکائے سکول جا رہے تھے۔ مولانا نے انہیں دیکھ کر افسوس سے کہا ''یہ جہنم کا ایندھن بننے جا رہے ہیں۔''

دو باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آئیں۔ ایک یہ کہ اس نظام تعلیم کے ہوتے ہوئے اسلامی انقلاب کہاں سے برآمد ہوگا اور کیسے برآمد ہوگا؟ اور دوسرے یہ کہ اسلامی انقلاب کے علمبردار اس بات پر غور کیوں نہیں کرتے اور اس کا مداوا کیوں نہیں کرتے؟

سانحۂ ساہیوال۔ انصاف کا سرِ عام قتل

اگر میں (خدانخواستہ) ملک کا چیف جسٹس ہوتا تو سانحۂ ساہیوال کے فیصلے کے بعد (اگرچہ یہ حرام کی موت ہوتی) لیکن میں فوراً خودکشی کر لیتا اس لیے کہ عدل و انصاف کے اس بہیمانہ قتل کے بعد میرے اس دنیا میں رہنے کا کوئی جواز نہ ہوتا۔ ویسے اگر لوگوں کے ضمیر زندہ ہوتے تو جونیئر ترین سول جج سے لے کر عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس تک، پولیس کے عام سپاہی سے لے کر صوبوں کے آئی جیز تک اور قانون نافذ کرنے والے سب اداروں کے چھوٹے بڑے اہل کاروں تک، پارلیمنٹ کے تمام اراکین سمیت تمام صوبائی اور وفاقی حکومتوں کے ذمہ داروں تک بلکہ تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین تک سب کو چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جانا چاہیے کہ وہ روز روشن میں ہونے والے بہیمانہ قتل عام کے جانے پہچانے قاتلوں کو باعزت بری ہوتا دیکھ کر بھی زندہ رہتے ہیں تو یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے؟

(پروفیسر ملک محمد حسین)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر طفیل ہاشمی

پاکستان میں جدید عصری تعلیم تباہی کے دہانے پر

دینی مدارس عصری تعلیم کی بحالی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں

ماضی بعید سے شروع کریں اور لارڈ میکالے کی کرم نوازی کا ذکر کریں تو بات لمبی ہو جائے گی۔ تاہم پاکستان میں تعلیم کے دونوں سلسلے یعنی دینی تعلیم اور رسمی یا جدید تعلیم قومی امنگوں کے مطابق استوار نہیں کیے گئے۔ دینی تعلیم صادق و امین لیکن ہر شعبۂ حیات میں متحرک، مستعد اور زندہ شہری پیدا کرنے کی بجائے امام، خطیب اور دینی تعلیم کے اساتذہ پیدا کرنے تک محدود ہو گئی جبکہ ان افراد کی ضرورت تو تھی لیکن محدود۔ ایسا کوئی سسٹم متعارف نہیں کروایا گیا کہ آٹھ دس [1] سال کی لازمی دینی تعلیم کے حصول کے بعد/ ساتھ رسمی تعلیم کا حصول بھی ممکن ہو اور ہم مسلم سیاست دان، متقی بیوروکریٹس، دیانت دار فوجی، امانت دار تاجر اور ایثار پیشہ زمیندار اور صنعت کار تیار کر سکیں۔ دوسری طرف رسمی تعلیم کسی حد تک ملک کی مادی ضروریات پوری کرتی تھی لیکن اس میں اسلام و اُخلاق کی آمیزش سرے سے نہیں تھی۔ پھر جب اسلامیات کی تعلیم لازمی کی گئی تو فرقے سامنے آ گئے۔ ہر فرقہ کا اسلام اپنا تھا نتیجتاً بہت کم امور ایسے تھے جن پر فرقہ وارانہ اتفاق ہو سکا اور وہی تین چار باتیں دوسری جماعت سے بی اے تک اسلامیات کے نام سے دہرائی جاتی ہیں۔

درمیان میں سمسٹر سسٹم آ گیا۔ جن ممالک میں واقعتاً سمسٹر سسٹم رائج ہے وہاں طلبہ کو چوبیس گھنٹے میں چار گھنٹے بھی سونے کے لیے بڑی مشکل سے دست یاب ہیں لیکن اس کے لیے اساتذہ کو بھی بے پناہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں دونوں کام مشکل تھے، ہم نے ہر مضمون کی سولہ پریزینٹیشن تیار کر لیں، انھی میں سے کوئز، اسائنمنٹ اور امتحان۔ ہر طالب علم کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ سوال آئیں گے۔ اگر کسی طالب علم کی تیاری درست نہ ہو تو استاذ مادی اور

[1] مصنف نے دو چار سال لکھا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ دین میں فرض تعلیم وہی ہے جسے دین بالضرورۃ کہا جاتا ہے لیکن اس کا تفصیلی اور مؤثر ہونا ضروری ہے۔ نیز دین کی ایسی موثر تعلیم جو اخلاق اور تعمیر شخصیت پر اثر انداز ہو اور آج کل کے عصری مائنڈ سیٹ کو اسلام پر مطمئن کر سکے، کے لیے ضروری ہے کہ بعد کی تعلیمی سطحوں پر بھی ہلکی پھلکی لیکن تخصص کے حوالے سے موثر دینی تعلیم جاری رہے۔

دیگر غیر اخلاقی تحائف لے کر اچھے نمبر دے دیتا، اور انہیں کہیں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

جنرل مشرف کے دور میں محدود پیمانے پر سیلف فائنانس سکیم کے تحت سیٹیں رکھی گئیں۔ عام ادارے بھی آمدنی کے اس ذریعے سے خوش ہوئے لیکن سب سے زیادہ فائدہ ان کی اپنی کمیونٹی کے بالائی طبقہ نے اٹھایا۔ دھڑا دھڑ پرائیویٹ کالجز اور جامعات بننا شروع ہو گئیں۔ اور ملک میں سب سے بڑی انڈسٹری ایجوکیشن انڈسٹری متعارف ہوگئی جو تمام تر سیلف فائنانس پر استوار کی گئی۔ جب تعلیم مارکیٹ کا مال ہوگئی تو یونیورسٹیز نے اس امر کو عملا رائج کر دیا کہ ڈگری حصول علم کا سرٹیفکیٹ نہیں بلکہ اداء فیس کی رسید ہے۔ سربراہان جامعات اپنی فیکلٹی کو بتاتے ہیں کہ جس بچے نے اتنے لاکھ روپے ہمارے ادارے میں جمع کروائے ہیں ہم اسے ڈگری دیئے بغیر کیسے بھیج سکتے ہیں؟ اس سارے عمل کے نتیجے میں ایک طرف غریب اور متوسط طبقے کی استطاعت سے تعلیم نکل گئی اور دوسری طرف وہ کسی اہلیت اور قابلیت کی علامت نہیں بلکہ قوت خرید کا نتیجہ ٹھہری۔

پھر اس پر یہ ستم کہ حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجی آفیسر جامعات کے سربراہ مقرر کرنے کا چلن عام ہو گیا جبکہ یہ معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں عسکری قیادت میں شامل ہونے کے لیے ایف اے/ ایف ایس سی پاس ہونا چاہیے۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کے پاس اعلی ڈگریاں بھی آ جاتی ہیں لیکن ان کی کہانی ناگفتہ ہی رہے تو بہتر ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ یہ قیادت آخری درجے کی ترقی پانے کے بعد بھی اکیڈیمک طور پر ایف اے سے بلند سطح کی نہیں ہوتی۔ اگر کسی فرد نے کوئی ادارہ بہتر طور پر چلایا ہے تو صرف جامعہ میں موجود مہارت کے تعاون اور مشاورت سے۔

ہم عسکری قیادت کی مختلف شعبوں میں دراندازی سے ہونے والے نقصانات کا ذکر کرتے رہتے ہیں لیکن ہماری رائے میں سب سے بڑا نقصان شعبۂ تعلیم میں ہوا کیونکہ سیاست، صنعت، تجارت اور رئیل اسٹیٹ بزنس کے سٹیک ہولڈرز ملک میں پہلے سے موجود تھے جبکہ تعلیم کا سٹیک ہولڈر کوئی نہیں تھا اس لیے اس کی تباہ حالی کا دکھ کسی کو نہیں ہوا۔

مزید برآں وہ مضامین جو قوموں کی دانش وتہذیب کے ارتقا میں کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں مثلاً فکر وفلسفہ، اخلاقیات، مذہب، تصوف، تاریخ، تہذیب اور دیگر سماجی اور عمرانی علوم وغیرہ سے متعلق تمام مضامین کو بیک جنبش قلم ختم کر کے قومی ترقی کا دار و مدار تاریں جوڑنے اور سکریو ٹائیٹ کرنے کو قرار دیا گیا۔ تعلیم کا تعلق انسانی شخصیت کے ارتقا کی بجائے مادی وسائل کے حصول سے ہو گیا اور کامیابی نے ایک نئے مفہوم کا لبادہ اوڑھ لیا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۷)

میڈیا مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

سوشل میڈیا، فتنۂ الحاد اور ہماری نئی نسل

ایک مسلمان کے لیے اولاد صرف ایک دنیوی نعمت ہی نہیں بلکہ آخرت کا سرمایہ اور بہترین صدقۂ جاریہ ہے بشرطیکہ کہ وہ صاحبِ ایمان ہو۔سوشل میڈیا کے اس دور میں ایمان کے ڈاکو کس طرح خاموشی سے ہماری آئندہ نسلوں کو الحاد یا Athiesm (خدا کے وجود سے انکار) کی طرف دھکیل رہے ہیں، اس کی تفصیل اس تحریر میں پیش کی جائے گی ۔تفریح (انٹرٹینمنٹ) کے لیے بظاہر پڑھائی اور اپنی ناسمجھ اولاد کو اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ تک غیر محدود رسائی دینے والے والدین بالخصوص اس تحریر کو پڑھیں۔ممکن ہے کہ خدانا خواستہ آپ کی اولاد اس فتنے کی زد میں آکر ایمان سے ہاتھ دھونے کے قریب ہو اور آپ بالکل لاعلم ہوں۔

کراچی، لاہور، اسلام آباد اور پاکستان کے دیگر شہروں میں اس وقت ملحدین (خدا کے وجود سے انکاری) کی تعداد سوشل میڈیا کے ذریعے تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس کا شکار عام مسلمان گھرانوں کے ۱۵، ۲۰ سال کے بچے بچیاں ہو رہے ہیں۔اس کی ایک دو نہیں سینکڑوں مثالیں ہیں اور علماء کرام دن رات اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔معاملہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا، بالخصوص فیس بک، انسٹا گرام اور ٹویٹر پر ایسے سیکڑوں اکاؤنٹس ہیں جن کا کام دن رات سائنسی بنیادوں پر خدا کے وجود سے انکار، دین اسلام کے مختلف احکام کا مذاق اڑانا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر اعتراض اور علماء کی تضحیک ہے۔ان میں سے اکثر کا تعلق یورپ اور امریکہ میں قائم مختلف این جی اوز سے ہے جن کا مقصد ہی یہ ہے۔عام طور سے ان کے نام اس انداز کے ہوتے ہیں:

Ex-Muslims Together, Atheist Muslims, Muslims Liberated, Muslim Awakening, Islam Exposed

ان کے کارکنان اور ان کی تعلیمات سے اتفاق رکھنے والے سیکڑوں لڑکے اور لڑکیاں (جو انہی ممالک میں مقیم اور جن میں سے اکثر دین سے مکمل ناآشنا اور مغربی تعلیمی نظام کی پیداوار ہیں) پاکستان، بنگلہ دیش، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب اور دیگر مسلمان ممالک

کے نوجوانوں کو راغب کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ بظاہر مسلمانوں کے نام سے اکاؤنٹس رکھتے ہیں مگر فکری طور پر ملحدین ہوتے ہیں۔ طریقہ واردات کچھ یوں ہوتا ہے کہ ابتداءً اسلام پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا بلکہ مختلف اسلامی احکام کو سائنس اور لاجک کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ جان بوجھ کر ایسے دینی موضوعات پر بات کی جاتی ہے جو سائنس سے بھی ثابت شدہ ہیں۔ اس طرح یہ ذہن سازی کی جاتی ہے کہ احکام دین سب کے سب سائنس سے مطابقت رکھتے ہیں اور جس چیز کی تصدیق سائنس کر دے وہ یقیناً حق ہے۔

اس کے بعد ایسے موضوعات کو کریدا جاتا ہے جو سائنس سے بالاتر ہیں مثلاً وجود خدا، وحی کا علم، واقعۂ معراج وغیرہ جن کا تعلق خالصتاً ایمان بالغیب سے ہے، جو یقیناً حق ہیں مگر سائنس کی دسترس سے باہر ہیں۔ مگر چونکہ ذہن سازی یہ کی گئی ہے کہ معیارِ حق سائنس ہے، چنانچہ ان کلیدی عقائد کو مشکوک کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد معاملہ آگے بڑھتا ہے اور بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتی زندگی پر آتی ہے۔ ان معاملات کو غلط انداز میں پیش کیا جاتا ہے جن کی وضاحت عام ذہنی سطح سے نسبتاً بلند ہو مثلاً غلامی کا فلسفہ، مرد عورت میں مساوات، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شادیاں اور باندیاں، تعدد ازدواج، سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی بوقت نکاح عمر وغیرہ۔

ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے لیے یہ معاملات واضح ہیں لیکن کچے ذہن کے مسلمان بچے بچیاں جو دین سے لاعلم اور مغربی طرزِ زندگی سے مرعوب ہیں ان کے لیے یہ باتیں نہایت پریشان کن اور ناقابل فہم ہیں اور چونکہ دین اور علمائے دین سے تعلق ہے نہیں اس لیے قابل تشفی جواب کا کوئی راستہ نہیں نتیجتاً وہ گوگل اور انٹرنیٹ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں جہاں انہی ملحدین کی مختلف ویب سائٹس ان کے شکوک کو یقین میں بدل دیتی ہیں۔ اس کے بعد ایمان تیزی سے رخصت ہوتا ہے۔ حج اور قربانی سے لے کر نکاح اور وراثت کے احکام تک اسلام کے ہر ہر حکم کو مغرب کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اور بالآخر اسے ایک من گھڑت مذہب قرار دے کر خاموشی سے ترک کر دیا جاتا ہے (العیاذ باللہ)

کھلم کھلا اسلام کا مذاق اڑانا، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا اور خدا کے وجود سے انکار کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔ پھر یہ بچے بچیاں خاموشی سے ایسی تنظیموں کے آلۂ

کار بن جاتے ہیں اور اپنے دوست احباب کو دین سے متنفر کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ خاموشی سے ہمارے گرد بیٹھے ۱۵ سے ۲۵ سال کے نوجوان Twitter، فیس بک وغیرہ پر کر رہے ہیں لیکن ہم بے خبر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اپنی اولاد کو اس سے کیسے بچایا جائے؟

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھیں:

* اللہ تعالیٰ سے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے سلامتیٔ ایمان اور استقامت کی دعا کا اہتمام کریں۔

* خود بھی اور اولاد کو بھی وقتاً فوقتاً علماء کرام کی مجالس اور بزرگانِ دین کی صحبت میں لے جاتے رہیں تاکہ وہ ان سے مانوس ہوں اور اپنے معاملات میں ان سے رہنمائی حاصل کریں۔

* اولاد کو خود سے قریب کریں، پیار دیں، ان کے مسائل کو سنیں، سمجھیں اور حل کریں۔ ان سے اپنے معاملات میں مشورہ کریں، ان کو اپنا رازدار بنائیں۔ اگر آپ انہیں دور رکھیں گے تو گمراہ کن گروہ ان کو آسانی سے اپنے قریب کر لیں گے۔

* اپنے دین کو آہستہ آہستہ سیکھیں اور گھر میں اس کا تذکرہ رکھیں۔

* اگر بچے چھوٹے ہیں تو دنیوی تعلیم کے ساتھ ان کی دینی تعلیم و تربیت کی بھی فکر کریں۔

* بغیر ضرورت شدیدہ بچوں کو اسمارٹ فون نہ دیں اور نہ خود رکھیں۔

* اگر دینا پڑے، تو شرائط کے ساتھ دیں۔ بے وقت استعمال پر پابندی رکھیں، رات کو تمام گھر کے فون اپنے کمرے میں جمع کروائیں، ان کو اس کے صحیح استعمال کا طریقہ بتائیں۔

* بے وجہ سوشل میڈیا پر وقت گزارنے سے خود بھی بچیں اور اولاد کو بھی بچائیں۔

* بچوں کے سامنے ہر وقت فون استعمال کرنے سے گریز کریں۔

* کسی بھی شک یا وضاحت طلب معاملے میں انٹرنیٹ کی بجائے مستند علماء دین سے رہنمائی حاصل کریں۔

* ایمان کو سلامتی کے ساتھ قبر میں لے جانا ایک مسلمان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اپنی اولاد کو ایمان کے ڈاکوؤں سے بچائیں تاکہ ہماری آئندہ نسلوں میں بھی دین باقی رہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے، آمین۔

میڈیا		محمد دین جوہر

تجدد اور میڈیا

تجدد کی مقبولیت کی وجہ اس کی فکری قوت نہیں بلکہ مغرب زدہ میڈیا کی اس کی حمایت ہے

متجددین کی اصل قوت عقلی یا نقلی دلائل نہیں بلکہ ہم عصر ثقافتی قوتوں کی ہمگامی ہے۔ ان میں سب سے بڑی قوت میڈیا ہے۔ میڈیا کی اثر اندازی فوراً متجددین کی اثر انگیزی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ برقی اور ورقی میڈیا کسی موقف کا صحیح غلط ہونا طے نہیں کرتا بلکہ اس کے ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ استعماری دَور سے طاقت اور سرمائے کی قوتیں اپنے پسندیدہ نظریات کے لیے میڈیا کو ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی چلی آئی ہیں یہ وراثت آزادی کے بعد زیادہ تر متجددین کے حصے میں آئی اگر طاقت، سرمائے اور کارپوریٹ میڈیا میں انکارِ حدیث کا موقف سامنے رہتا ہے اور روایتی عقیدے کو جگہ نہیں ملتی تو یہی عام دینی موقف کے طور پر رائج ہو جاتا ہے۔ پبلک میڈیا میں ایسی کسی فکر کا ردسامنے آنا حد درجہ اہم ہے۔ میڈیائی بادبان پر رواں دینی موقف ایسے تھپیڑوں کی تاب نہیں لاتے۔ جدید اسلام میڈیائی تسلسل میں زندہ اور مؤثر رہتا ہے کیونکہ یہ جدید ثقافتی ضرورت ہے۔ صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کے نمائندے بدلتے رہتے ہیں، موقف نہیں بدلتا۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ صدی کے بڑے بڑے متجددین کے نام سے بھی عام آدمی واقف نہیں۔ میڈیا کی اثر اندازی جدید اسلام کے "اسرارِ دین" میں سے ہے۔

اردو کی تباہی میں حصہ نہ لیں

ادارہ

اپنے کمپیوٹر اور موبائل میں اُردو کی بورڈ اَپ لوڈ کریں اور رومن اردو ہرگز نہ لکھیں، ورنہ اردو کی موت کے آپ بھی ذمہ دار ہوں گے کیونکہ اس سے جتنی بھی کتابیں اس وقت اردو رسم الخط میں موجود ہیں وہ سب اگلی نسلوں کی سمجھ میں نہیں آپائیں گی۔ اس بے راہ روی کے فروغ میں وہ سب لوگ شامل ہوں گے جو اردو لکھنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود رومن لکھ لکھ کر اگلی نسل کو غیر ارادی طور پر اردو سے دور کر رہے ہیں۔ یہ محض ایک خام خیالی نہیں کیونکہ پچھلی صدی میں تُرکی قوم کے ساتھ یہی ہوا تھا اور وہ صدیوں سے جاری "اب ج" میں لکھی جانے والی ترکی کو چھوڑ کر "ABC" میں ترکی لکھنے لگ گئے تھے۔ یوں ساری قوم اپنے قیمتی سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

عالم اسلام

ڈاکٹر شفیق انجم [۱]

چین میں مسلمانوں پر مظالم کا آنکھوں دیکھا حال (۲)

چینی ترکستان (سنکیانگ) میں ایغور مسلمانوں کے دردناک حالات کا چشم کشا مشاہدہ

ارومچی شہر

ارومچی شہر میں یوں تو خوف کے سائے گہرے ہیں اور پولیس کی ٹولیاں اور جگہ جگہ چیکنگ کے اسباب دیکھ کر جی گھبرا اٹھتا ہے لیکن اس مٹی میں عجب طلسم ہے۔ موت جیسی ہولناک تلخی کے باوجود شیرینی اور مٹھاس کے چشمے بھی رواں دواں ہیں۔ یہاں کے چہرے عجب چہرے ہیں کہ دم بخود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہاں کی آنکھیں عجب آنکھیں ہیں کہ اک ذرا پل میں کرچی کرچی کر کے رکھ دیتی ہیں۔ یہاں کے تیوروں میں وہ تندی ہے کہ پتھر کا دل بھی ہو تو پگھل جائے۔ پس اس طلسم میں طلسم ہوئے بغیر رہنا محال ہے۔ اس شہرِ طلسم آفریں میں جتنے دن گزرے، آس پاس انگ انگ چھلنی کرتی آنکھیں رہیں، الاؤ پھونکتے تیور رہے، ریزہ ریزہ کرتی مسکراہٹیں رہیں اور جبر واستحصال کے دوزخ آثار ماحول میں بھی محبت کے پھریر لہراتے رہے۔ نقش در نقش ایک عجب خوشبو کہانی ہے کہ جو نہ لکھی جاتی ہے نہ بھلائی جاتی ہے۔ عجب رنجیدگی ہے کہ جس کے پہلو بہ پہلو کھنکھناتی شوخیوں کی کلیاں کھِلی ہیں، افسردگی ہے کہ جس کی دیواروں کے ساتھ ملائم نقش ونگار کی بیلیں پھیلتی چلی جاتی ہیں، عجب مجبوری ہے کہ جس کی کھردری فصیلوں کے کنارے کنارے ریشمیں لمس کی مرمریت دھیرے دھیرے اُترتی چلی جاتی ہے۔ عجب دکھ ہے کہ جس کی تہہ میں کہیں کوئی سرخوشی لہریے بناتی ازل تا ابد رواں دواں ہے۔ گرنے، مٹنے، تھک کر ڈھے جانے نہیں دیتی۔ خوف کے بھوت پرا باندھے سامنے کھڑے ہیں اور سورج سوا نیزے پر اُترتا صاف دکھائی دیتا ہے لیکن امید، زندہ تابناک مسکرائے چلی جاتی ہے۔ بس مسکرائے چلے جاتی ہے۔

ارومچی میں ایغور، قازق، تاجک، کرغس اور ترک لوگوں سے دوستی ہوئی تو پتہ چلا کہ ان کی زندگیاں دو انتہاؤں میں منقسم ہیں۔ ایک طرف دکھ، اضمحلال اور غم وغصہ ہے تو دوسری طرف فطری شوخی، سرمستی، بے نیازی اور الھڑپن ہے۔ انہیں دیکھا جب وہ عالم غم میں ہوتے ہیں، اور انہیں دیکھا جب وہ عالم وجد میں ہوتے ہیں۔ ہر دو کیفیات میں انہیں دل چیر کے رکھ

---

[۱] راولپنڈی 0334-5503953

دینے کا ہنر آتا ہے۔کوئی کیسا ہی دیوقامت، پہاڑ ہمت کیوں نہ ہو، ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔ رقص اور موسیقی اور آرائش وزیبائش میں یہ لوگ باکمال ہیں۔

ہن چینی

ارومچی میں ہن چینی بھی بکثرت ہیں۔۲۰۰۹ء کے ہنگاموں کے بعد سے اگرچہ یہ لوگ خوفزدہ ہیں لیکن حکومت کی طرف سے انہیں بھرپور حوصلہ افزائی حاصل ہے۔اچھے برے تو ہر قوم قبیلے میں ہوتے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر کو اچھا پایا۔چینی زبان میں دوست کے لیے لفظ پھنگ یُو ہے۔پس بہت سے چینی ہمارے پھنگ یو تھے۔ان میں عام زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے اور پروفیشنلز بھی۔کریانے کی دکان والے میاں بیوی، سبزی فروٹ کی دکان والی آنٹی اور اس کی بیٹی، گفٹ شاپ والی مالکن اور اس کی خوبرو ملازمہ، شوز سٹور والی مالکن، متفرق چیزیں ٹھیک کرنے والا چینی ہرفن مولا، تھری لی کیفے اور بار والا گٹکو، کے ایف سی کاؤنٹر والی کرنچی، برگر کنگ کاؤنٹر والی ببلی، گروسری سٹور کی مالکن اور اس کی بیٹی سوہنی، ہوٹل مینجمنٹ سے وابستہ ڈولی، ہسپتال والی ڈاکٹرانیاں اور نرسیں، میوزیم والی آنٹی اور انکل، برگر کارنر والا گنجو اور اس کی سہیلی اور بہت سے کاروباری و ملازمتی زندگی سے وابستہ ہر عمر اور مزاج کے لوگ۔ان سب میں محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ بھرا دیکھا۔کاروباری مزاج اپنی جگہ لیکن کاروبار سے کچھ ہٹ کر تعلق بنانے اور بڑھانے کا رویہ ان میں ایسا تھا کہ تعریف کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔پھنگ یو لڑکیوں سے ان کی زندگی کی کہانیاں سننے کا اتفاق ہوا۔جن کا لب لباب یہ ہے کہ چین میں لڑکیاں چونکہ لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں اس لیے ان کے مسائل بھی گوناگوں ہیں۔جاب حاصل کرنا ایک مشکل کام ہے اور مقابلہ اتنا زیادہ ہے کہ لائنیں لگی ہوئی ہیں۔اگر جاب مل بھی جائے تو رہائش اور یوٹیلیٹی بلز اور ٹیکسز میں بہت ساری آمدنی کٹ جاتی ہے۔اچھی زندگی گزارنے کی خواہش بڑھ رہی ہے لیکن وسائل محدود ہیں۔شادیوں کے مقابلے میں طلاق اور علیحدگی کی شرح بہت زیادہ ہے۔لڑکے پسندیدہ نہیں۔جو پسندیدہ ہیں وہ ملتے نہیں۔نتیجہ یہ کہ سنگل زندگی گزارنے کا فیشن بڑھ رہا ہے۔زیادہ اور جلد کمائی کی خواہش میں زیادہ تر لڑکیاں گلیمر انڈسٹری کا رُخ کررہی ہیں لیکن تسلی بخش زندگی نہیں۔بڑے بڑے ہوٹلوں اور کاروباری کمپنیوں کے پے رول پر آجانے سے کچھ اطمینان ملتا ہے۔لیکن سروسز کا یہ دورانیہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔عمر اور صحت کے ایک خاص معیار سے نکلتے ہی کنٹریکٹ ختم

کر دیا جاتا ہے۔ پھر نجی طور پر کچھ کرنا پڑتا ہے۔

چین میں طوائف پیشگی پر سرکاری طور پر پابندی ہے لیکن لاکھوں لڑکیاں اس پیشے سے وابستہ ہیں۔ حکومت رجسٹر نہیں کرتی لیکن غربت کے خیال سے کچھ کہتی بھی نہیں۔ جاب اور کوئی چھوٹا موٹا کاروبار اگر نہیں تو زندگی گزارنا بے حد مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودکشیوں کی شرح بھی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ خاندانی نظام پہلے کافی مضبوط تھا لیکن اب تقریباً بکھر چکا ہے۔ بچے پیدا کرنا اور پالنا اب لوگوں کی خواہش نہیں۔ حکومت کی ایک گھرانہ ایک بچہ پالیسی نے جو بیزاری پیدا کی اب اس کے نقصانات سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں اور اگرچہ حال ہی میں حکومت نے ایک گھرانہ دو بچے کی اجازت دے دی ہے لیکن بہت کم لوگ ایسا کرنا چاہیں گے۔ معاشی دباؤ کے باعث ہم جنسیت کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ چین میں اعلانیہ ایسا کرنا جرم ہے لیکن پچاس فیصد لڑکے لڑکیاں اس رجحان کے زیر اثر زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ محض فیشن نہیں بلکہ اس سے معاش بھی وابستہ ہو رہا ہے۔ انڈسٹری میں اب ایک بڑا شعبہ یہ بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عالمی منڈیوں کا رجحان بھی بدل چکا ہے۔ ان دوستوں کی فرمائش اور اصرار پر اروچی شہر میں کچھ ایسی جگہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ جہاں جدید زندگی کا دوسرا رُخ پوری آب وتاب پر تھا۔ معاشی عفریت کے پنجے تلے معصوم لوگ پس رہے ہیں، بے بس ہیں، مر رہے ہیں لیکن سرمایہ داریت میگا سٹرکچر بنوا رہی ہے، میگا پروجیکٹس شروع کروا رہی ہے اور ان کی حفاظت کے لیے جنگی ساز وسامان کی ریل پیل کر رہی ہے، کرۂ ہوائی اور اس سے باہر خلائی دنیا پر قبضے کے دوڑ دوڑا رہی ہے، اور زمین پر معصوم لوگ دو وقت کی روٹی کے لیے ترس رہے ہیں، جسم بیچ رہے ہیں، ذلت کے کچوکے کھا رہے ہیں اور کوئی پرسان حال نہیں۔

سنکیانگ

سنکیانگ کہنے کو تو اٹانومس ریجن (خود مختار علاقہ) ہے لیکن فوج، پولیس، بیوروکریسی، سیاسی نمائندگی، کرنسی، تعلیم، ثقافت، غرض ہر شعبے میں مرکزی حکومت کا مکمل کنٹرول ہے۔ ریجن میں سرکاری طور پر اگرچہ چینی کے ساتھ ایغور زبان کو بھی جگہ دی گئی ہے اور سائن بورڈز سے لے کر احکامات وہدایات اور ٹیکنالوجیکل ایسسریز میں ایغور کا آپشن موجود ہے لیکن غلبہ چینی زبان ہی کو حاصل ہے۔ آفیشل معاملات میں چینی زبان ہی استعمال ہوتی ہے۔ تعلیم وتعلم کی زبان چینی ہے اور تمام قسم کا نصابی مواد بھی چینی میں ہے۔ یہی وجہ ہے ایغوروں کی نوجوان نسل

چینی زبان روانی سے بولتی اور لکھتی ہے۔ ہر شہر میں عوامی مقامات، ہوٹلوں، بازاروں، چوک چوراہوں، بسوں، ریلوں، ہوائی اڈوں غرض ہر جگہ بڑی سکرینیں نصب کر کے چینی پروگرام، اشتہار اور ترانے چلائے جاتے ہیں تاکہ مسلسل لوگوں کے کانوں تک وہ کچھ پہنچتا رہے جو مطلوب ہے۔ شہر میں کہیں بھی چلے جائیں قریب و دور کے کسی نہ کسی سکرین پوائنٹ کی آواز سنائی دیتی رہے گی۔ ایک چینی نغمہ کی جس میں، مَیں چینی ہوں، یہ چینی سرزمین ہے اور میں اس کا وفادار ہوں جیسے بول مسلسل ہیں، اس تکرار سے سننے کو ملا کہ سوتے میں بھی اس کی گونج برقرار رہتی تھی۔ سکولوں میں چینی اور ایغور بچے یکساں نصاب پڑھتے اور یکساں ذہن سازی کے عمل سے گزرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے مراحل میں بھی یہی طور ہے۔ پس نئی نسل کے نوجوان لڑکیاں لڑکے نسلی اعتبار سے تو ایغور مسلمان ہیں لیکن عملاً تمام وکمال چینی ہو چکے ہیں۔ بہت سوں نے چینیوں کے ساتھ شادیاں رچالی ہیں اور اپنے خاندانوں سے رابطہ توڑ لیا ہے۔ ہوٹلوں، بازاروں، کلبوں اور پبوں میں اس دوطرفہ اشتراک کی زیادہ واضح صورتیں اور آئندہ کے امکانات بخوبی نظر آتے ہیں۔ ماڈرن ایغور لڑکیاں لڑکے اپنے چینی دوستوں کے ساتھ بہ رضا و رغبت پیتے پلاتے اور ہلّا گلّا کرتے متعدد بار دیکھے۔ ایسا بزور طاقت بھی کرایا جاتا ہے۔ ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ ایغور لڑکیوں کو اٹھانے اور انہیں خاص اطوار کا عادی بنا کر تقسیم کرتے جانے کی ہزاروں مثالیں ہیں۔ جہاں زور زبردستی نہیں وہاں ترقی، پیسے اور نئی زندگی کے خواب دکھا کر اپنا بنالیا جاتا ہے۔ چین کی ٹاپ ماڈلز میں اس وقت کئی ایغور لڑکیاں ہیں۔ اسی طرح گلیمر انڈسٹری میں بھی ایک بڑی تعداد انہی کی ہے۔ ان کے علاوہ باقی جو کچھ بچتا ہے وہ ظلم سہتا، خدا کے سہارے جیتا ہے اور فی الحقیقت یہی وہ مخلوق ہے جس کے لیے شاید کبھی آسمان اپنی مدد اتارنے پر مجبور ہو جائے۔

ثقافتی پالیسی

چین کی ثقافتی پالیسی پورے ملک کے لیے یکساں ہے۔ مختلف علاقوں کی مقامی ثقافتوں کو اگرچہ قبول کیا جاتا ہے لیکن انہیں نمایاں نہیں ہونے دیا جاتا۔ چینیوں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ کسی کی دکان بند نہیں کراتے بلکہ اس کے مقابل اپنی بڑی سی دکان کھول لیتے ہیں۔ اور وہ سب کچھ وافر اور سستے داموں بیچتے ہیں جو سامنے والا بیچتا ہے۔ نتیجتاً کچھ ہی عرصے میں مقابل کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ سنکیانگ میں حاوی ثقافت ایغور ثقافت تھی اور ان کی مسجدیں، مکانات اور بازار دور سے نظر آتے اور اپنی طرف توجہ کھینچتے تھے۔ اب ان کے پہلو بہ پہلو بلند و بالا

شاپنگ مالز، ہوٹلوں اور رہائشی عمارتوں کی ایسی گنجانی ہے کہ ایغوروں کے مراکز دبے دبے سے اور بعض صورتوں میں بے محل لگنے لگے ہیں۔ ارومچی شہر کے مرکز کی پہاڑی اور ارد گرد کے وسیع علاقے میں ہونگ شن پارک بنادیا گیا جس کے دور سے نظر آنے والی اونچائی پر سٹوپا کھڑا ہے۔ سب سڑکوں اور گلی محلوں کے ایغور ناموں کے مقابلے میں چینی نام وضع کر کے سائن بورڈوں پر چسپاں کر دیے گئے ہیں اور اب وہ انہی ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ شہر بھر میں سٹریٹ لائٹس کے کھمبوں پر چین کے سرخ ثقافتی پھریرے اور آرائشی پھندنے بڑے اہتمام کے ساتھ لٹکائے جاتے اور ان کی صفائی ستھرائی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ چین کے قومی دن اور تہوار خصوصیت سے منائے جاتے اور بڑے پیمانے پر تقریبات منعقد کر کے سب کو ان میں شمولیت پر راغب کیا جاتا ہے۔ ایغور ثقافتی آثار کو محفوظ رکھنے کے لیے ارومچی میں ایک بڑا میوزیم بنادیا گیا ہے لیکن اپنے طرز تعمیر کی بدولت اس کا پہلا تاثر چینی ہے۔ ایغور کے علاقے کا سب سے بڑا بازار جو دہ بازار کہلاتا تھا اب اپنی تمام تر ثقافتی شناخت کے باوجود چینی اردا چیو ہے۔ ایغوروں کے لباس، کھانوں، کھیل تماشوں، شادی بیاہ کے طور طریقوں اور عیدوں شب راتوں کو منظم حکمت عملی کے ساتھ محدود تر کر دیا گیا ہے۔ مسلم اکثریت کے شہروں میں بھی شہر کے اندر کوئی قبرستان نہیں، باہر کہیں ہو تو دیکھا نہیں۔ مسجدیں ہیں مگر اذان کی صدا بلند نہیں ہوتی۔ مقررہ وقت پر کھولا اور بند کر دیا جاتا ہے۔ مسلم مذہبی ثقافت کا زور توڑنے کے لیے بدھ مذہبی ثقافت کو مقابل لایا جارہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عیسائیت پر بھی کچھ خاص تعرض نہیں۔ ارومچی شہر کے شمال میں بدھ مذہبی ثقافت کے آثار نمایاں کرنے کے لیے وسیع و عریض رقبے پر پارک بنایا گیا ہے جس کے وسط میں بدھ خداؤں کے بلند و بالا مجسمے ہیں۔ بدھ لٹریچر بھی عام ہے اور جیڈ اور قیمتی دھاتوں سے بنے مجسمے بیچنا خریدنا بھی اچھا ہے لیکن قرآن رکھنا اور پڑھنا جرم بلکہ سنگین جرم ہے۔ پس کسی دکان پر قرآن نہیں ملے گا۔ مسلم تاریخ و ثقافت پر کتابیں نہیں ملیں گی۔ مصلے، ٹوپیاں اور تسبیحیں چین خود بناتا اور ساری دنیا میں سپلائی کرتا ہے لیکن سنکیانگ میں ان کا خریدنا اور بیچنا جرم ہے۔ گویا ایک جامع منصوبے کے ساتھ ایغور مسلمانوں اور ان کے ثقافتی آثار کو دیوار سے لگانے اور رفتہ رفتہ معدوم کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔ حکومت کی سخت نشریاتی پالیسی کے سبب کوئی خبر باہر نہیں جانے پاتی اور یہی وجہ ہے کہ چین عالمی سطح پر سب اچھا کا تاثر دینے میں کامیاب ہوتا ہے حالانکہ اندر کی حقیقت یہ ہے کہ سنکیانگ کے سوا کروڑ ایغور مسلمان دم گھونٹ کر مارے جارہے ہیں اور افسوس صد افسوس کہ جاننے والے بھی نہیں بولتے، تماشا دیکھ رہے ہیں۔ (جاری ہے)

ملی مجلس شرعی

ڈاکٹر محمد امین
سیکرٹری جنرل

سارے دینی مکاتب فکر کی مشترکہ علمی مجلس

ملی مجلس شرعی کے اہم فیصلے

جاوید غامدی کے نظریات گمراہ کن ہیں۔ دینی مدارس وسکولوں کے لیے یکساں نصاب تیار کرنے کا فیصلہ

ملی مجلس شرعی کا ایک اہم اجلاس مورخہ ۲۸ ستمبر ۲۰۱۹ء کو جامعہ اسلامیہ، جوہر ٹاؤن، لاہور میں ہوا جس کی صدارت مولانا مفتی محمد خاں قادری صاحب نے کی۔ اجلاس میں بحث ومناقشہ اور غور وفکر کے بعد مندرجہ ذیل فیصلے ہوئے:

۱۔ مجلس کی قائم کردہ کمیٹی کی رپورٹ، جو مجلس نے اپنے پچھلے اجلاس منعقدہ ۲۳ جون ۲۰۱۹ء کو قائم کی تھی تاکہ وہ جاوید غامدی صاحب کے نظریات کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کرے، مجلس میں پیش کی گئی جس میں جاوید غامدی صاحب کے نظریات کو تجدد، گمراہی اور فرقہ واریت پر مبنی، فتنہ وفساد کا موجب اور دین وامت کے لیے ضرر رساں قرار دیا گیا تھا، مجلس نے اتفاق رائے سے منظور کر لی اور اسے مشتہر کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ عوام الناس غامدی صاحب کے اور ان کے تلامذہ کے گمراہ کن نظریات سے متنبہ رہیں اور علماء کرام اس کے خلاف علمی، دعوتی اور اصلاحی جدوجہد کریں۔

۲۔ حافظ ڈاکٹر حسن مدنی صاحب نے تجویز پیش کی کہ جاوید غامدی اور ان کے مکتب فکر کے خلاف دو درجن سے زیادہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور بہت سے جرائد کے خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں، ان کا مطالعہ کر کے ان کا ملخص اور حاصلِ مطالعہ مجلس کو شائع کرنا چاہیے۔ مجلس نے انہی کے ذمے لگایا کہ وہ یہ کام کر کے مجلس کے اگلے اجلاس میں پیش کریں جسے دیکھنے کے بعد مجلس اس پر مزید پیش رفت کا فیصلہ کرے گی۔

۳۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے توجہ دلائی پر کہ مرکزی وزارت تعلیم میں سکولوں اور دینی مدارس کے یکساں نصاب کے لیے ۲۰ گروپ تندہی سے کام کر رہے ہیں جن میں

مدارس اور دینی قوتوں کی نمائندگی موجود نہیں اور ایک دفعہ اگر کام مکمل ہوگیا اور حکومت اسے نافذ کرنے پر تل گئی تو دینی مدارس کو اسے طوعاً و کرہاً قبول کرنا پڑے گا۔ اس پر مجلس نے مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جو سکولوں اور مدارس کے یکساں نصاب کے سلسلے میں نصابی خاکے تیار کرے گی، جو مجلس کے اگلے اجلاس میں منظوری کے بعد حکومت اور وفاقوں کو بھجوائے جائیں گے:

i۔ پروفیسر ملک محمد حسین (ماہرِ جدید نصابیات)

ii۔ حافظ ڈاکٹر حسن مدنی (مدرس جامعہ لاہور الاسلامیہ و پنجاب یونیورسٹی)

iii۔ مولانا غضنفر عزیز (مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور)

iv۔ ڈاکٹر محمد امین (پروفیسر علوم اسلامیہ) کوآرڈی نیٹر

۴۔ مجلس کے علماء کرام نے جنرل اسمبلی میں وزیر اعظم پاکستان عمران خان کی تقریر کو سراہا اور جس جرأت سے انہوں نے اسلام کا مقدمہ عالمی سطح پر لڑا اور کشمیر کی حمایت کی، اسے مجلس نے خوش آئند قرار دیا۔ مجلس نے اس تجویز پر بھی مسرت کا اظہار کیا کہ ترکی، ملائشیا اور پاکستان مل کر ایک ٹی وی چینل قائم کریں گے تا کہ اسلام کا صحیح امیج دنیا تک پہنچایا جا سکے اور مغربی فکر و تہذیب کے چیلنج اور اسلاموفوبیا کا مقابلہ کیا جا سکے اور مجلس کے سیکرٹری جنرل کو کہا کہ وہ ایسے میڈیا ماہرین کو تلاش کریں جو ایمانی اور فنی لحاظ سے اس تجویز پر موثر عمل درآمد کے لیے ٹھوس تجاویز تیار کریں تا کہ وہ متعلقہ فورم تک پہنچائی جا سکیں۔

جن علماء کرام نے جاوید غامدی کے بارے میں رپورٹ کی منظوری دی ان میں مولانا عبدالمالک، مولانا ملک عبدالرؤف، مولانا مفتی محمد خاں قادری، حافظ عاکف سعید، مولانا فضل الرحیم، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، مولانا زاہد الراشدی، مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی، مولانا عبدالرؤف فاروقی، علامہ نیاز حسین نقوی، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، شیخ الحدیث مولانا محمد رمضان سلفی، علامہ خلیل الرحمن قادری، حافظ ڈاکٹر حسن مدنی، مولانا قاری جمیل الرحمن اختر، پروفیسر ڈاکٹر علی اکبر الازہری، مولانا حافظ محمد نعمان، مولانا غضنفر عزیز، مولانا مقصود احمد، حافظ ڈاکٹر محمد زبیر، مولانا سید قطب اور دیگر علماء کرام شامل تھے۔

ملی مجلس شرعی

ڈاکٹر محمد امین
سیکرٹری جنرل

تمام دینی مکاتب فکر کا متفقہ فیصلہ

جاوید غامدی کے نظریات گمراہ کن ہیں

تجدد پر مبنی اور فتنہ وفساد کا موجب ہیں اور دین وامت کے لیے ضرر رساں ہیں

ملی مجلس شرعی تمام مکاتب فکر کے اہم اور معتدل علماء کرام کی ایک مشترکہ علمی مجلس ہے جو پچھلے دس سال سے کام کر رہی ہے۔ مجلس نے اپنے اجلاس مورخہ ۲۳ جون ۲۰۱۹ء میں جاوید غامدی صاحب کے پرچے اشراق میں شائع ہونے والے ایک مضمون کی مذمت کی تھی جس میں حفظ قرآن کو بدعت قرار دیا گیا تھا۔ اس موقع پر مندرجہ ذیل اہل علم پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے ذمہ لگایا گیا کہ وہ جاوید غامدی صاحب کے نظریات کا جائزہ لے اور ان کے بارے میں ایک رپورٹ مجلس کے اگلے اجلاس میں پیش کرے:

۱۔ مولانا عبدالمالک صاحب، مہتمم جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ وصدر وفاق رابطۃ المدارس الاسلامیہ

۲۔ مولانا عبدالرؤف فاروقی، مہتمم جامعہ اسلامیہ کامونکی (و جنرل سیکرٹری جمعیت علماء اسلام (س)

۳۔ علامہ محمد خلیل الرحمن قادری، ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ، جوہر ٹاؤن، لاہور

۴۔ حافظ ڈاکٹر حسن مدنی، مدرس جامعہ لاہور الاسلامیہ و پنجاب یونیورسٹی

۵۔ ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف لاہور وسیکرٹری جنرل مجلس (کوآرڈی نیٹر)

مذکورہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ مجلس کے اجلاس منعقدہ ۲۸ ستمبر ۲۰۱۹ء بصدارت مولانا مفتی محمد خاں قادری صاحب پیش کی جو بحث ومناقشہ کے بعد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی اور اس موضوع پر مزید کام کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ مجلس کی منظور کردہ رپورٹ کا متن درج ذیل ہے:

جاوید غامدی صاحب کی فکر کے بارے میں علماء کرام کی رائے

''ہم نے جاوید احمد غامدی صاحب کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے جو عرصے سے شائع ہو رہا ہے۔ ٹی وی پر ان کے لیکچرز بھی مسلسل نشر ہوتے رہتے ہیں اور اخبارات وجرائد میں بھی ان کے افکار طبع ہوتے رہتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان کے افکار ونظریات معاشرے میں معلوم

ومعروف ہیں اوران میں کوئی غموض نہیں ہے۔

ہم نے اختصار کوملحوظ رکھتے ہوئے ان کے افکارونظریات کا ایک ملخص باحوالہ تیارکیا ہے جو یہ ہے:

سنت کا گمراہ کن تصور

۱۔ سنت سے مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجدید واصلاح اوربعض اضافوں کے ساتھ دین کی حیثیت سے جاری فرمایا اورسنتوں کی تعداد کل ملا کر 26 ہے۔[میزان:ص14،2018ء]

۲۔ سنت کاتعلق محض عمل سے ہے۔علم وعقیدہ،تاریخ اورشان نزول وغیرہ کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایمانیات اورعلمی نوعیت کی کوئی بھی چیز سنت نہیں ہے۔[میزان:ص 59-60،2018ء]

۳۔ سنت،خبرواحد سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ اجماع اورعملی تواتر سے ثابت ہوتی ہے۔ [میزان:ص62،2018ء]

۴۔ حدیث کی تبلیغ اورحفاظت کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اہتمام نہیں فرمایا بلکہ سننے اوردیکھنے والوں کے لیے چھوڑ دیا کہ چاہیں تو انہیں آگے پہنچائیں اور چاہیں تو انہیں چھوڑ دیں لہذا حدیث سے دین میں کوئی عقیدہ اورعمل ثابت نہیں ہوتا۔[میزان: ص 15، 2018ء]

اجماع کاانکار

۱۔ اجماع نقل دین میں حجت ہے نہ کہ فہم دین میں یعنی صرف ایسا اجماع حجت ہے جو قرآن یا سنت ابراہیمی کی نقل وروایت پر ہو نہ کہ ان کے معنی ومفہوم پر۔[میزان:ص 13-14،2018ء]

۲۔ دین کے مصادروماخذ میں اجماع کا شماراوراضافہ ایک بدعت ہے۔[مقامات: ص157،2014ء]

رجم کاانکار

شادی شدہ زانی مرداورعورت کے لیے رجم کی سزانہیں ہے بلکہ سوکوڑوں کی سزا ہے اور

امام فراہی کے بقول رجم کی سزا زنا بالجبر یا زنا کو پیشہ بنانے والوں کے لیے ہے۔[برہان:ص 91-92، 2009ء]

حلال وحرام میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی کردار نہیں

قرآن مجید نے کھانے کی چار اشیاء کے علاوہ صرف پانچ چیزوں کو حرام کہا ہے یعنی شرک، بدعت، فواحش، حق تلفی اور ناحق زیادتی۔ ان نو کے علاوہ کسی چیز کو حرام کہنے کا اختیار کسی کے پاس نہیں ہے۔ اگر کسی نے کسی چیز کو حرام کہنا ہے تو وہ ان قسموں ہی کی ایک ذیلی قسم کے طور اسے ثابت کرے گا تو کہہ سکتا ہے ورنہ نہیں۔[مقامات:ص201، 2014ء]

داڑھی دینی حکم نہیں ہے

داڑھی دین کا حکم نہیں ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے میں جو کچھ فرمایا تو اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ مونچھیں اور داڑھی رکھنے کی ہیئت متکبرانہ نہیں ہونی چاہیے کہ ڈاڑھی مونڈ کر مونچھیں بڑھا لینا یہ پسندیدہ نہیں ہے، اس سے منع کیا ہے۔[مقامات:ص 238، 2014ء]

قراءات کا انکار

۱۔ مغرب اسلامی کے مسلمان ممالک میں جو قراءات بطور قرآن رائج ہیں، وہ قرآن مجید نہیں ہیں۔[میزان:ص27، 2018ء]

۲۔ روایت حفص کے علاوہ بقیہ قراءات فتنہ ہیں۔[میزان:ص32، 2018ء]

اب ارتداد کی سزا نہیں دی جاسکتی

ارتداد کی سزا صرف انہی لوگ کے لیے خاص تھی جن پر براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجت قائم کی تھی۔[مقامات:ص280، 2014ء]

نزول مسیح کا انکار

نزول مسیح علیہ السلام کا تذکرہ علامات قیامت کے طور کرنا درست نہیں ہے، ان کی دنیا میں واپسی نہیں ہوگی اور اس بارے مروی روایات قرآن مجید سے متعارض ہیں۔[میزان:ص 181-182، 2018ء]

مہدئ موعود کا انکار

مہدی موعود کا قیامت کی نشانیوں کے طور تذکرہ کرنا درست نہیں ہے کیونکہ اس بارے

میں جو مستند روایات ہیں، ان کا مصداق حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تھے۔[میزان: ص 181۔182، 2018ء]

غیر مسلم بھی اجتہاد کر سکتا ہے

اجتہاد کرنے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے، سب لوگوں کو اجتہاد کرنا چاہیے، اگر کچھ غلط کریں گے تو دوسرے انہیں ٹھیک کر دیں گے۔ اجتہاد غیر مسلم بھی کر سکتا ہے اور مسلمان اسے "ضالۃ المؤمن" سمجھ کر قبول کر لے گا جیسا کہ علماء وفقہاء نے مغرب کے جمہوری اداروں کی تشکیل اوران کے ضوابط کو قبول کر لیا ہے جو اصلاً ان کا اجتہاد تھا۔[مقامات: ص154، 155، 2014ء]

سود کی اباحت

جو اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورت کے لیے سودی قرض لیتے ہیں تو ان کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ان علماء اور صلحاء کا جو بینکوں میں اپنا پیسہ رکھوا کر اپنی ضرورت پوری کر رہے ہیں۔ [مقامات: ص216، 2014ء]

عورتوں کے لیے دوپٹہ لینا واجب نہیں

عورتوں کے لیے سر کی اوڑھنی واجب نہیں ہے البتہ پسندیدہ ہو سکتی ہے۔[مقامات: ص 249، 2014ء]

انتہا پسندی کا منبع دینی مدارس ومساجد ہیں

۱۔ انتہا پسندی کا عفریت اس مذہبی فکر کا مولود ہے جو نفاذ شریعت اور جہاد وقتال کے زیرعنوان ہمارے مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔[مقامات: ص197، 2014ء]

۲۔ جمعہ کے منبر اور مساجد کا علماء کے پاس ہونا مذہبی انتہا پسندی کی اصل وجہ ہے اور انتہا پسندی کا خاتمہ اسی صورت ممکن ہے جبکہ یہ مسند علماء سے لے کر ارباب اقتدار کو دے دی جائے۔[مقامات: ص200، 2014ء]

معروف ومنکر کی اساس فطرت ہے (نہ کہ نص)

قرآن نے جسے معروف ومنکر کہا ہے، وہ روز اول سے انسانی فطرت میں ودیعت شدہ

ہےاور پورا دین انہی فطری حقائق سے مل کر مکمل ہوتا ہے۔[میزان: ص48، 2018ء]

دینی جماعتیں اور مدارس انتہا پسندی پھیلا رہے ہیں

اس وقت جو صورتِ حال بعض انتہا پسند تنظیموں نے اپنے اقدامات سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے پوری دنیا میں پیدا کر دی ہے، یہ اُسی فکر کا نتیجہ ہے جو ہمارے مذہبی مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، اور جس کی تبلیغ اسلامی تحریکیں اور مذہبی سیاسی جماعتیں شب و روز کرتی ہیں۔[اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ، روزنامہ جنگ 22 جنوری، 2015ء]

ریاست اور اسلام میں کوئی تعلق نہیں

یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اس کو بھی کسی قراردادِ مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔[اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ، روزنامہ جنگ 22 جنوری، 2015ء]

خلافت کی مخالفت

نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔[اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ، روزنامہ جنگ 22 جنوری، 2015ء]

غلط فکر وعمل کے حامل مسلمان کو گمراہ کہا جا سکتا ہے (کافر نہیں)

دنیا میں جو لوگ مسلمان ہیں، اپنے مسلمان ہونے کا اقرار، بلکہ اس پر اصرار کرتے ہیں، مگر کوئی ایسا عقیدہ یا عمل اختیار کر لیتے ہیں جسے کوئی عالم یا علما یا دوسرے تمام مسلمان صحیح نہیں سمجھتے، ان کے عقیدے یا عمل کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے، اسے ضلالت اور گمراہی کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے حاملین چونکہ قرآن وحدیث ہی سے استدلال کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے اُنہیں غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔[اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ، روزنامہ جنگ 22 جنوری، 2015ء]

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آراء صحابہ کرام، تابعین، اسلاف اور ائمہ مجتہدین کے متفقہ فہم دین کے خلاف ہیں اور اسلامی تعلیمات کو مغربی فکر و تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی کوشش اور تجدد پر مبنی ہیں۔ نیز یہ دین اسلام کی محافظ اسلامی تحریکوں اور دینی مدارس کے خلاف مذہبی منافرت پھیلانے کی ایک باضابطہ کوشش ہیں۔ ہماری رائے میں دین کی یہ نئی تعبیر بالکل غلط ہے اور امت میں فکری و ذہنی انتشار کے علاوہ دینی طبقات کے خلاف عدم برداشت اور انارکی پھیلانے کا سبب بن رہی ہے۔ دین کی بنیادی اور اصولی باتوں سے انحراف کے نتیجے میں جاوید غامدی صاحب نے متعدد دینی مسائل کی تعبیر و توضیح میں جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے مترادف ہے اور عوام الناس کو اباحیت پسندی کی طرف راغب کرنے اور دین کی حقیقی روح سے دور کرنے والا ہے۔ لہٰذا ہم اس ملک کے عوام و خواص سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ جاوید غامدی صاحب کے ان متجددانہ، فرقہ وارانہ اور گمراہ کن افکار سے دور رہیں اور ان سے بچنے کی کوشش کریں کہ یہ اسلام کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔

یاد رہے کہ ہم یہاں جاوید غامدی صاحب کی بعض ذاتی آراء تک محدود رہے ہیں اور ان کے احباب و تلامذہ نے ان میں جو رنگ آمیزیاں اور اضافے کیے ہیں ہم نے ان سے صَرفِ نظر کیا ہے کہ جب بنیاد ہی غلط ہو تو اس پر جو بھی عمارت بنے گی وہ بھی ٹیڑھی ہی ہوگی۔ ان حالات میں علماء کرام کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ان گمراہ کن آراء کے مضمرات سے عوام کو آگاہ کریں اور علمی، فکری اور اصلاحی سطح پر ان کا ردّ کریں۔

جو اصحاب اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں وہ غامدی صاحب کی کتابوں اور الیکٹرانک و سوشل میڈیا پر ان کی آراء سے رجوع کریں اور ان کی آراء پر جمہور اہل علم کا مؤقف جاننے کے لیے حافظ صلاح الدین یوسف، حافظ ڈاکٹر محمد زبیر، مولانا پروفیسر محمد رفیق اور ماہنامہ صفدر، البرہان اور محدث کی تحریروں کا مطالعہ کریں۔

مجلس کے جن ارکان نے غامدی صاحب کے بارے میں رائے دی ان کے اسمائے گرامی

۱۔ مولانا مفتی محمد خاں قادری (مہتمم جامعہ اسلامیہ لاہور و صدر ملی مجلس شرعی)

۲۔ مولانا عبدالمالک (صدر وفاق رابطہ المدارس الدینیہ و مہتمم جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ)

۳۔ مولانا ملک عبدالرؤف (جنرل سیکرٹری متحدہ علماء کونسل و مہتمم جامعہ عثمانیہ لاہور)

۴۔ مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی (مہتمم جامعہ اہل حدیث لاہور و صدر جماعت اہلحدیث پاکستان)

۵۔ مولانا زاہد الراشدی (شیخ الحدیث جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ و مدیر شریعہ اکیڈمی)

۶۔ علامہ نیاز حسین نقوی (نائب مہتمم جامعہ المنتظر لاہور و نائب صدر وفاق المدارس الشیعہ پاکستان)

۷۔ حافظ عاکف سعید (امیر تنظیم اسلامی پاکستان)

۸۔ مولانا عبدالرؤف فاروقی (مہتمم جامعہ اسلامیہ کامونکی و جنرل سیکرٹری جمعیت علماء اسلام (س)

۹۔ مولانا حافظ فضل الرحیم (مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور)

۱۰۔ مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی (مہتمم جامعہ لاہور الاسلامیہ)

۱۱۔ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ (نائب صدر جماعت اسلامی پاکستان)

۱۲۔ علامہ خلیل الرحمن قادری (ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ، جوہر ٹاؤن لاہور)

۱۳۔ مولانا عزیز الرحمن ثانی (مجلس تحفظ ختم نبوت، لاہور)

۱۴۔ مولانا محمد رمضان سلفی (شیخ الحدیث جامعہ لاہور الاسلامیہ گارڈن ٹاؤن، لاہور)

۱۵۔ مولانا قاری جمیل الرحمن اختر (مہتمم جامعہ حنفیہ قادریہ و صدر پاکستان شریعت کونسل، پنجاب)

۱۶۔ حافظ ڈاکٹر حسن مدنی، (مدیر ماہنامہ محدث و پروفیسر پنجاب یونیورسٹی)

۱۷۔ مولانا غضنفر عزیز (مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور و رکن جمعیت علماء اسلام (ف)

۱۸۔ مولانا مقصود احمد (مدرس جامعہ عمر بن عبدالعزیز، فیروز پور روڈ، لاہور)

۱۹۔ ڈاکٹر علی اکبر الازہری (سابق چیف ریسرچ آفیسر تحریک منہاج القرآن و پروفیسر گریژن یونیورسٹی)

۲۰۔ مولانا سید قطب (مدرس جامعہ مرکز علوم اسلامیہ، منصورہ، لاہور)

۲۱۔ حافظ ڈاکٹر زبیر (شعبہ تحقیق تنظیم اسلامی و پروفیسر علوم اسلامیہ کامیسٹ یونیورسٹی)

۲۲۔ مولانا حافظ محمد نعمان (سابق ناظم اعلیٰ جامعۃ الخیر و مدیر ادارہ الفوز، لاہور)

۲۳۔ ڈاکٹر محمد امین (پروفیسر علوم اسلامیہ یونیورسٹی آف لاہور و ناظم اعلیٰ ملی مجلس شرعی)

تفہیم مغرب

مولانا مفتی علی عمران قادری[۱]

مغربی تہذیب کی اصطلاحات کو اسلامی معانی نہیں پہنائے جا سکتے

اصطلاحات کی حقیقت و حیثیت کو سمجھنا ضروری ہے

کسی اصطلاح کے نہ تو لغوی معنی لیے جا سکتے ہیں اور نہ کسی ایک تہذیب کی اصطلاح دوسری تہذیب میں جا کر اپنا مفہوم تبدیل کر سکتی ہے

اصطلاح کا مفہوم

جب کوئی قوم یا تہذیب کسی لفظ کے لغوی مفہوم کے علاوہ یا اس سے ملتے جلتے کوئی اور معنی ٹھہرا لیتی ہے تو اسے اصطلاح کہتے ہیں۔

Word or phrase used to describe a thing or to express a concept, especially in a particular kind of language or branch of study.

اصطلاحات کے متعلق قواعد وضوابط

۱۔ ہر اصطلاح کا ایک فکری پس منظر ہوتا ہے۔

یعنی جب کسی لفظ کو بطور اصطلاح استعمال کیا جائے گا تو اس کا پس منظر مدنظر رکھا جائے گا جیسا کہ لفظ ’’یوم دفاع‘‘ ہے۔ اس کے استعمال کے وقت فوراً ذہن میں چھ ستمبر کے واقعات کا پس منظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ’’نائین الیون‘‘ کی اصطلاح بولتے ہی ایک خاص پس منظر دماغ میں روشن ہو جاتا ہے۔

۲۔ کسی لفظ کو اصطلاحی مفہوم دینے کے بعد اس کی تشریح کا حق اسی کو حاصل ہوتا ہے جس نے وہ اصطلاح بنائی ہو۔

مثال کے طور پر ایک شخص ایک اصطلاح وضع کرتا ہے جس کے لیے وہ لفظ ’’Cold‘‘ استعمال کرتا ہے اب اس نے اس کا نام ’’Cold‘‘ کیوں رکھا؟ کوئی دوسرا شخص اپنی طرف سے اس کی تشریح نہیں کر سکتا۔

۳۔ جب کوئی اصطلاح بن جاتی ہے تو اس کے لغوی معنی معتبر نہیں ہوتے۔

---

[۱] مدرس جامعہ فریدیہ، ساہیوال

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسی بھی قوم، علاقے یا مذہب کی اصطلاحات کو لغوی معانی کے اعتبار سے اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

مثال کے طور پر اسلام میں ایک اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جیسے ''حج'' کہا جاتا ہے۔ جو کہ ایک خاص پس منظر اور کیفیت میں مستعمل ہے۔ اب اگر کوئی شخص لفظ حج کے لغوی معنی ''ارادہ کرنا'' کو بنیاد بنا کر یہ کہے کہ چونکہ میں آفس جانے کا ارادہ کر چکا ہوں لہٰذا اسے ''حج'' قرار دیا جائے تو یقیناً اس کے عمل کو ''حج'' سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح لفظ ''زکوٰۃ'' کے لغوی معنی ''پاک کرنے'' کے ہیں لیکن اگر کوئی اس لغوی معنی کے لحاظ سے کپڑے دھو کر کہے کہ مَیں نے ''زکوٰۃ'' ادا کر دی ہے تو یہ بات تسلیم نہیں کی جائے گی۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ جب کوئی اصطلاح بن جاتی ہے تو اس کے لغوی معنی معتبر نہیں ہوتے تو یہ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ Freedom کے معنی آزادی ، Equaliy کے معنی مساوات، Progress کا مطلب ترقی ،Democracy کے معنی جمہوریت اور Human Being کے معنی انسان کے ہیں۔

ایک لطیفہ

ایک مسلمان اور غیر مسلم انگریز کی آپس میں دوستی ہوگئی۔ انگریز کو اُردو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور اس نے ڈکشنری خرید لی۔ ایک دن اس کے مسلمان دوست نے دورانِ گفتگو لفظ ''عدت'' استعمال کیا۔ انگریز نے اس کے اصطلاحی معنی پوچھنے کی بجائے ڈکشنری میں اس کے لغوی معنی دیکھے تو وہ تھے''To count'' جس کے اردو میں لغوی معنی ہیں ''گننا''۔ کچھ دنوں کے بعد مسلمان اس انگریز سے اس کے گھر ملنے آیا اور دروازے پر دستک دی تو اس کا انگریز دوست کافی دیر بعد باہر آیا۔ مسلمان نے اس سے تاخیر کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا میں ''عدت'' میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی اس بات پر مسلمان خوب ہنسا اور کہنے لگا صاحب! مرد ''عدت'' میں نہیں بیٹھتے بلکہ خواتین بیٹھتی ہیں۔ تو اس انگریز نے کہا آپ نے ہی یہ لفظ بولا تھا تو میں نے ڈکشنری میں اس کا معنی دیکھا جو ''گننا'' لکھا ہوا تھا، میری تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ میں اندر بیٹھا کچھ رقم گِن رہا تھا، تو میں نے سوچا کہ آپ کے سامنے ایک نیا لفظ بولوں۔

ذرا غور کیجیے! اصطلاح کے درست معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے کس طرح معاملات اور تفہیم

میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب ہم Freedom, Equality, Progress اور Democracy کی مغربی اصطلاحات کو ان الفاظ کے اردو میں لغوی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں تو اس سے تفہیم میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے۔

۴۔ کسی بھی اصطلاح کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔

مثال کے طور پر ایک شخص جس کا نام ''کاشف'' ہو اگر اس کا ذکر آپ کسی انگریزی مضمون میں کرنا چاہتے ہیں تو آپ پورے مضمون میں اس کا نام ''کاشف'' ہی لکھیں گے جو کہ اس کے لیے بطور اصطلاح وضع کیا گیا ہے۔ آپ یقیناً اس کا لغوی معنی یا ترجمہ ''Opner'' نہیں لکھیں گے اس لیے کہ ''Opner'' لکھنے سے کوئی اصل شخصیت کو نہیں پہچان سکے گا۔ لہٰذا ہر اصطلاح کو بغیر کسی ردوبدل کے ویسے ہی ذکر کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اگر آپ اسلام کے تصور ''مساوات'' پر انگریزی میں کتاب لکھنا چاہتے ہیں تو آپ ''مساوات'' کا ترجمہ ''Equality'' نہیں کرسکتے بلکہ پوری کتاب میں آپ کو اصطلاح ''مساوات'' کو ''Musawat'' ہی لکھنا چاہیے اس لیے کہ ''Equality'' اور اسلام کے تصور مساوات میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

مغربی اصطلاحات کا جائزہ

اب ذیل میں چند مغربی اصطلاحات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس کے بعد ہم اندازہ لگالیں گے کہ کس طرح اصطلاحات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم پر مغربی تہذیب کو مسلط کیا جارہا ہے۔

۱۔ Feedom (فریڈم)

مغربی تہذیب میں ''Feedom'' کا معنی ہے اپنی مرضی کرنا اور اپنے علاوہ کسی کی نہ ماننا۔ گویا مغرب کے نزدیک وہی شخص ''Feedom'' کا حامل ہے جو ہر طرح کی بیرونی پابندیوں، روایتی اقدار اور خاندانی دباؤ سے اثر نہ لیتا ہو۔ یعنی جو انسان دوسرے کے دباؤ کا شکار ہوجائے وہ اپنے آپ کو ''Human Being'' کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔

اصطلاح ''Feedom'' کے نتائج

۔ خیر اور شر کا تعین نفس کرے گا۔ یعنی اس کے نزدیک جو چیز اچھی ہے بس وہی اچھی

ہے اور جو چیز بری ہے بس وہی بری ہے، چاہے مذہب اس کے خلاف کہے۔

- حلال اور حرام کا تعین بھی عقل یا جذبات سے ہوگا۔

اصطلاح''Feedom'' کا بانی

اس نظریہ کا بانی ڈیکارٹ ہے۔ اس نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جس میں ہر اس علم اور ادراک کا ردّ کیا گیا جو عقل کے علاوہ کسی غیر سے لیا جائے کیونکہ ڈیکارٹ کے نزدیک انسان خود ہی علم کا اصل ماخذ ہے۔ اس بات کو اس نے اس دلیل سے ثابت کیا کہ''I think therefor I am''یعنی اپنے علاوہ ہر چیز پر شک ہوسکتا ہے اور صرف میرا اپنا وجود ہی یقینی ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے وجود کے علاوہ یہ شک کی گنجائش رہتی ہے کہ آیا وہ چیز حقیقت میں موجود بھی ہے یا محض میری آنکھوں کا دھوکہ ہے۔ میری عقل میں یہ استطاعت نہیں ہے کہ اپنے علاوہ کسی دوسری ہستی کو تسلیم کروں لہذا مَیں اپنے علاوہ تمام ہستیوں کا انکار کرتا ہوں۔ ڈیکارٹ کے نظریہ نے طے کردیا کہ:

- انسان کو ہی کائنات کی اصل مانا جائے۔
- عقل ہی معیارِ کلّی ہے۔

اسلام میں آزادی کا تصور

اسلام میں آزادی کا تصور یہ ہے کہ خیر اور شر کا تعین وحی کے تابع ہے۔ اب بندے کو اختیار ہے کہ وہ خیر کو اختیار کرے یا شر کو لیکن ساتھ ساتھ ترغیب ہے کہ خیر کو اختیار کیا جائے اور شر سے بچا جائے۔

گویا کہ اسلام کے تصور آزادی اور مغرب کے تصور''Feedom''میں واضح فرق یہ ہے کہ اسلام خیر اور شر کو متعین کرنے کے بعد اس کو اختیار کرنے کی آزادی دیتا ہے جبکہ مغرب کا نظریہ''Feedom''خیر اور شر کو متعین کرنے کی بات کرتا ہے۔

نظریہ''Feedom''کے مفاسد

- انسان ہر قسم کی مذہبی پابندی سے آزاد ہوگا۔
- لواطت اور زنا برضا ان کے نزدیک جائز ہوگا۔
- انبیاء اور رسل کے حوالہ سے ہر قسم کی رائے رکھنے کی آزادی ہوگی چاہے وہ ان کی

عظمت کے حق میں ہو یا خلاف۔اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی دفعہ ۲۴ بھی آزادیٔ اظہاررائے کی بات کرتی ہے۔

- انسان شتر بے مہار ہے۔جس طرح مرد کو چار شادیوں کا اختیار ہے اسی طرح عورت کو بھی حق حاصل ہوگا۔

- آزادیٔ اظہارِرائے (Freedom of speach) کے تحت کسی بھی جگہ، وقت اور ماحول میں ہرطرح کی بات کہنے کی اجازت ہے۔

- مذہبی افکار، روایتی اقدار اور خاندانی اخلاقیات کی پابندیوں کو توڑ کر اپنی رائے کی مطابق زندگی بسر کی جائے۔

- اس بات کو بعض مغربی مفکرین بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ نظریۂ ''Freedom'' نے خاندانی نظام کو مکمل طور پر تباہ کر دیا ہے۔

۲۔ Equality

''Equality'' سے مراد یہ ہے کہ ہر معیار خیر اور شر برابر ہے۔

مغربی فلسفہ کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ تمام انسانوں کے پاس عقل موجود ہے لہٰذا جب تمام انسان عقل میں برابر ہیں تو احکام ومسائل میں بھی برابر ہونے چاہئیں۔مسلمان اور کافر، مرد اور عورت، رسول اور امتی، باپ اور بیٹا الغرض تمام ناطے برابر ہیں۔لہٰذا باپ بیٹے کو نہیں ڈانٹ سکتا۔جس طرح مرد کا وارثت میں حق ہے اسی طرح عورت کا بھی وہی حق ہوگا تو مساوات متصور ہوگی۔

اسلامی نظریۂ ''مساوات''

جو قانون بندوں کے لیے خالق نے وضع کر دیا ہے اس کو نافذ کرنے میں مساوات ہوگی۔اب چاہے وہ امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا رعایا سب پر اسلام کا قانون برابر نافذ کیا جائے گا۔مثلاً خالق نے چور کی حد ہاتھ کاٹنا بیان کی ہے تو اب جو بھی چوری کرے گا اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

اسلامی نظریۂ مساوات اور مغربی نظریہ ''Equality'' میں بنیادی فرق

اسلام میں حق کا تعین خالق کی طرف سے ہوتا ہے، اس کو نافذ کرنے میں برابری اسلامی

نظریۂ مساوات ہے جبکہ مغربی نظریہ کے مطابق ''حق'' کا تعین انسان خود کرتا ہے لہٰذا حقوق سب کے برابر ہوں گے۔

مثلاً مسلمان وراثت میں مرد کو دو گنا اور عورت کو ایک گنا حصہ دیتے ہیں کیونکہ خالق نے ایسا ہی متعین کیا ہے جبکہ مغرب حقوق بھی خود متعین کرتا ہے اور اس نے دونوں کا حصہ برابر رکھا ہے۔

نظریۂ ''Equality'' کا ردّ

مثال کے طور پر ایک شخص کے گھر میں گھوڑا، گائے، بھینس اور مرغیاں ہوں ان کا مالک ان کے اجسام کی ضرورت کے پیش نظر خوراک متعین کرتا ہے اور اپنے ملازم کو اس کے مطابق خوراک دینے کا پابند کرتا ہے۔ اب اگر وہ ملازم ''Equality'' کے پیش نظر سب کو برابر مقدار میں خوراک دے گا تو یقیناً ''فساد'' واقع ہوگا لہٰذا ان کو ان کی جسمانی کیفیت کے مطابق خوراک دینا ہی انصاف ہے۔

نظریۂ ''Equality'' سے پیدا ہونے والے مفاسد

- جب خواتین کے حوالہ سے مردوں کے شانہ بشانہ اور ہر ماحول میں ہر جگہ کام کرنے میں ''Equality'' کا رجحان بڑھا تو اس کی بدولت اخلاقی طور پر بے حد تباہی ہوئی اور نوجوان نسل عریانی و فحاشی کا شکار ہوگئی۔
- حفظ مراتب کا فقدان ہوا جس کی وجہ سے بے ادبی کی فضا قائم ہوئی۔
- جب اس اصول کے تحت اسلامی قوانین کو دیکھا جانے لگا تو شکوک و شبہات کی ایک لہر پیدا ہوگئی کہ وراثت اور طلاق میں بھی عورت کو ''Equal'' حق دیا جائے۔
- اقوام متحدہ کے ''انسانی حقوق کا عالمی منشور'' کی دفعہ ۱۶ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ''بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت یا مذہب کی بناء پر لگائی گئی ہو شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی گزارنے اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔'' اس دفعہ کی روشنی میں معاشرے میں سوائے فساد کے اور کچھ پیدا نہیں ہوسکتا۔
- ''Equality'' کی اصطلاح نے ہمارے ہاں بھی جڑیں مضبوط کر لی ہیں جیسے مختلف مواقع پر دیے جانے والے اعزازات میں بغیر کسی فرق کے تمغۂ حسن کارکردگی دیا جاتا

ہے مثلاً بہترین قاری، بہترین نعت خواں اور بہترین گلوکار کو ایک ہی ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے کیونکہ سب نے عقل استعمال کی لہٰذا ’’Equal‘‘ ٹھہرے جبکہ ہمارے ہاں معیار یہ ہے کہ ’’تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔‘‘

۳۔ Progress (پراگریس)

۔ ’’Progress‘‘ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کے پاس جتنا زیادہ سرمایہ ہوگا وہ ترقی یافتہ تصور کیا جائے گا۔ ایک مقولہ ہے ’’Progress is not possible without freedom‘‘ یعنی پروگریس ’’Freedom‘‘ کے بغیر ممکن نہیں۔ گویا کہ ’’Freedom‘‘ کا ایک وجود سرمایہ ہے جس کے حصول کے لیے کوشش کرنا ’’Progress‘‘ کہلاتا ہے۔

۔ مغربی فلسفہ میں یہ بات طے شدہ ہے کہ ’’Human Being‘‘ کا کمال اور معراج یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر آزاد ہو اور یہ موقوف ہے سرمایہ پر، تو لامحالہ اصل مقصد زندگی سرمایہ کا حصول ہے اور وہ اسی دنیا میں ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے:

"Getting free from theology and substituting psychology"

پروگریس ہے جبکہ مومن کا مقصدِ زندگی آخرت کی کامیابی ہے۔

اسلام کے عبد اور مغرب کے Human Being کی ایمانیات

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ’’عبد‘‘ جو اپنے سے اعلیٰ کسی بالائی طاقت پر یقین رکھتا ہے اور جس کو اپنے عمل پر سرزنش کا خوف ہو کہ کوئی مجھ سے اس کام کے کرنے یا نہ کرنے پر پوچھ سکتا ہے، چونکہ آخرت پر ایمان رکھتا ہے لہٰذا اس کے تمام نظریات و افعال عقیدۂ آخرت کے گرد گھومیں گے اور جو نظریات، افکار و اعمال اسے آخرت میں نفع دیں گے وہ ان کو اختیار کرے گا جبکہ ’’Human Being‘‘ کی ایمانیات اسی دنیا کے گرد گھومتی ہیں لہٰذا اس کے نظریات، افکار اور اعمال و سعی اسی دنیا کو بہتر بنانے میں صرف ہوگی۔

’’عبد‘‘ کی زندگی اور علم کا مقصد آخرت میں کامیابی ہے جبکہ ’’Human Being‘‘ کے علم اور زندگی کا مقصد صرف دنیا کی کامیابی ہے۔

ایک مضحکہ خیز پہلو

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر آپ اہل مغرب سے

''Freedom'' اور''Equality'' کا مطالبہ کرو گے تو وہ آپ کو وہی دیں گے جو آپ ان سے مانگ رہے ہیں۔ لہٰذا پہلے دیکھ تو لو کہ کیا طلب کر رہے ہو؟ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے پاکستان کے ایک علاقہ میں لفظ''کھیر'' کی اصطلاح دودھ میں چاول وغیرہ ڈال کر جو پکایا جاتا ہے اس کے لیے بولی جاتی ہے جب کہ سرائیکی خطہ میں''کھیر'' کی اصطلاح صرف دودھ کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ لہٰذا آپ سرائیکی خطہ میں''کھیر'' مانگو گے تو آپ کو دودھ ملے گا، چاولوں والی کھیر نہیں ملے گی۔ یہی حال ہمارا ہے کہ مغرب سے ہم''Freedom'' اور ''Equality'' مانگتے ہیں تو وہ ہمیں اس کے مطابق اسباب و ذرائع فراہم کرتے ہیں جس کے ذریعہ ہم بھی عبدیت سے نکل کر''Humanity'' کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔

خلاصۂ بحث

- ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے لٹریچر میں اصطلاحات کو بطور اصطلاح ہی ذکر کریں تاکہ اس لفظ کو اپنے اصلی مفہوم میں سمجھا جائے مثلاً جہاں پوری انسانیت کا ذکر کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے''Human Being'' کا لفظ استعمال کرنے کی بجائے''انسان'' کا لفظ استعمال کیا جائے۔''Equality'' کی بجائے''مساوات'' کا ذکر کیا جائے وغیرہ۔

- ''عبد'' اللہ کے قانون کا تابع ہوتا ہے جبکہ''Human Being'' اپنی عقل کے متعین کردہ قوانین کی پیروی کرتا ہے۔

- اہل مغرب نظریہ''Equality'' اور''Freedom of Speach'' کو بنیاد بنا کر ہی انبیا کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کی توہین کو اپنا حق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے قائم کرے۔

- یہ بات ذہن میں راسخ رہے کہ حقوق برابر نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جو حقوق متعین کر دیے جاتے ہیں ان کے نفاذ میں برابری ہے مثلاً عورت اور مرد کے حقوق و فرائض ایک دوسرے سے مختلف ہیں جبکہ اہل مغرب حقوق میں''Equality'' کی بات کر کے ہم جنس پرستی جیسے گھناؤنے قوانین وضع کرتے ہیں۔

- مغربی نظریات کو پھیلانے کا بنیادی کردار''میڈیا'' اور''خاص طرز کا نصاب تعلیم'' ہے جس میں صرف خواہشات کی تکمیل کی بات کی جاتی ہے جبکہ''عبد'' رضا اور قناعت کی بات کرتا ہے۔

پاکستانیات مدیر

عمران خاں کیوں ناکام ہو رہا ہے؟

ایک علمی اور غیر سیاسی تجزیہ

عمران خاں کے سیاسی حریف خوش ہیں کہ عمران خاں ناکام ہو رہا ہے۔ عوام مہنگائی کے ہاتھوں پریشان ہیں، تاجر ٹیکس نہیں دیتے، انڈسٹریلسٹ باہر بھاگ گئے ہیں، بیوروکریسی تعاون نہیں کرتی، ڈاکٹر ہڑتال پر ہیں، سیاست دانوں نے مارچ اور دھرنے شروع کر دیے ہیں روپے کی قیمت گر گئی، ڈالر آسمان پر چلا گیا، آئی ایم ایف اپنا شکنجہ تنگ کر رہا ہے۔ غرض تاش کے پتے بکھر رہے ہیں، معاشرہ بکھر رہا ہے اور خان معاملات کو سنبھال نہیں پا رہا، اس کے باوجود کہ اسے فوج اور عدلیہ کی حمایت حاصل ہے اور اس کے باوجود کہ ہمسایہ چین اور دوست ممالک نے اسے قرض اور امداد دے کر پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود خان جو تبدیلی لانا چاہتا تھا وہ نہیں لا سکا اور اس کے پیر اُکھڑ رہے ہیں۔ آخر کیوں؟

اس کے حریف اور سیاسی تجزیہ کار اس ناکامی کے مختلف تجزیے کریں گے اور کر رہے ہیں۔ ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ خان نے تبدیلی (Change) لانا چاہی لیکن تبدیلی لانے والے (Change Agent) تیار نہیں کیے۔ خان نے اگر قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پڑھی ہوتی تو اسے پتہ چلتا کہ تبدیلی ’’آدمی‘‘ لاتا ہے۔ آدمی کو تبدیل کیے بغیر کوئی حقیقی اور پائیدار تبدیلی آ ہی نہیں سکتی، خواہ وہ تھوڑے ہوں۔ ہمارے رہبر و رہنما اور کائنات کے سب سے بڑے اور کامیاب لیڈر نے ۱۳ سال جان توڑ محنت کی اور جب حریفوں سے پہلی ٹکر ہوئی تو اس کے ساتھ صرف ۳۱۳ آدمی تھے لیکن یہ خصوصی طور پر تیار کیے گئے اور تبدیل کیے گئے آدمی تھے۔ ان ۳۱۳ نے کائنات کا رُخ تبدیل کر دیا۔ اگلے ایک ہزار سال تک دنیا کی کوئی قوت مسلمانوں کے سامنے کھڑی نہ ہو سکی اور آج مہبطِ وحی سے ہزاروں میل دور اور ساڑھے چودہ سو سال بعد یہ ہندو زادہ جو یہ الفاظ لکھ رہا ہے اس کے ساتھ ان ۳۱۳ کی آواز سے آواز ملانے والے اس بتکدۂ ہند (برصغیر پاک و بھارت) میں ۷۰ کروڑ سے زائد ہیں۔ **اللہ اکبر!** اسے کہتے ہیں تبدیلی۔ خان! تم نے تبدیلی کا خواب دیکھا لیکن تبدیلی کے لیے آدمی تیار نہیں کیے۔ جب وقت آزمائش آیا تو تمھیں کامیابی کے لیے ادھار کے کرپٹ آدمی پکڑنے پڑے۔ بھلا ادھار کے پکڑے ہوئے کرپٹ آدمیوں سے انقلاب آتا ہے؟ نہیں خان! تم تبدیلی کا میکنزم سمجھے ہی نہیں کہ تبدیلی کیسے آتی ہے۔ تم تبدیلی کیسے لاتے؟

پاکستانیات مدیر

مسئلہ کشمیر کا صحیح حل۔ کشمیری جہاد کریں

کشمیری پس رہے ہیں۔ ٹھیک ہے آج ظلم زیادہ ہو گیا ہے لیکن وہ عرصے سے پس رہے ہیں، مر رہے ہیں۔ ہزاروں شہید ہو چکے ہیں، ہزاروں جیلوں میں ہیں اور ہزاروں زخمی اور معذور پڑے ہیں۔ وہ مزاحمت ضرور کر رہے ہیں لیکن سلبی اور مدافعتی قسم کی جبکہ انہیں ضرورت ہے فعال و حرکی مزاحمت کی جس کی شریعت مظلوموں کو اجازت دیتی ہے۔ بھئی! روز آپ کے آدمی شہید ہوتے ہیں۔ یہ کیا مزاحمت ہے؟ ایک شہید ہونے والا کم از کم ایک ظالم اور کافر کو توقتل کرے پھر شہید ہو۔ اس طرح اگر آپ کے ایک ہزار آدمی شہید ہوتے ہیں تو ایک ہزار ظالم و کافر بھارتی فوجی بھی تو مریں گے اور اسے کچھ احساس تو ہو گا کہ اس کا بھی نقصان ہو رہا ہے۔ موجودہ صورت میں تو صرف آپ کا نقصان ہو رہا ہے۔ بھارتیوں کا تو کوئی نقصان نہیں ہو رہا۔ بلکہ اگر آپ گوریلا جنگ شروع کر دیں تو آپ کا ایک آدمی شہید ہونے سے پہلے سیکڑوں بھارتی فوجیوں کو جہنم واصل کر سکتا ہے۔

افغانیوں کی مثال آپ کے سامنے ہے کہ کیسے انہوں نے گوریلا جنگ سے امریکہ اور نیٹو کو شکست دی۔ لہٰذا آپ بھی اپنی پالیسی بدلیں اور جہاد شروع کر دیں۔ یہ نہ سوچیں کہ اسلحہ کہاں سے آئے گا؟ جب آپ جہاد عملاً شروع کر دیں گے تو اسلحہ بھی ملنا شروع ہو جائے گا۔ لوگ آپ کی مدد کریں گے۔ خود بھارتیوں کا اسلحہ ہی آپ کے لیے کافی ہو گا۔ پاکستان، چین اور دوسرے مسلم ممالک کو بھی آپ کی مدد کرنی چاہیے اور وہ کسی نہ کسی صورت میں کریں گے بھی لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ جہاد شروع کر دیں۔ آپ قربانی دیں گے تو کشمیر آزاد ہو گا۔ قربانی تو آپ اس قوت بھی دے رہے ہیں لیکن بے کار قسم کی۔ خود مرنے سے پہلے کافروں کو ماریں، پھر ہی بنیا بھاگے گا اور ''غزوۂ ہند'' کی طرف دروازہ کھلے گا۔

پاکستانیات

پروفیسر طارق بٹ

دینی قوتیں۔ ہوشیار باش

مولانا فضل الرحمن کی کامیابی اور ناکامی دونوں صورتوں میں ملک کی دینی قوتوں پر کڑا وقت آنے کا خدشہ ہے

تحریر: ۲۴/ اکتوبر ۲۰۱۹ء

اگرچہ مولانا فضل الرحمن صاحب کا مارچ اور دھرنا کسی دینی مسئلے کے لیے نہیں بلکہ یہ ایک سیاسی تحریک ہے کہ ان کی رائے میں سابقہ الیکشن منصفانہ نہیں ہوا جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ الیکشن ہار گئے حالانکہ وہ پچھلے تیس سال سے جیت رہے تھے اور جنرل مشرف کی فوجی حکومت ہو یا بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی سیاسی حکومت، وہ سب سے حصہ وصول کرتے اور شریک اقتدار رہتے تھے۔ ممتاز قادریؒ کی پھانسی ہو، آسیہ مسیح کی رہائی ہو یا عورتوں کے حقوق کے بل ہوں مولانا نے کبھی ان میں دینی قوتوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ہمیشہ ان حکومتوں کا ساتھ دیا جن میں وہ شریک اقتدار تھے۔ اب بھی کسی دینی جماعت نے ان کی حمایت نہیں کی، کسی وفاق المدارس نے ان کی حمایت نہیں کی۔

بظاہر اس کا امکان کم نظر آتا ہے کہ مولانا اور حکومت میں مذاکرات کامیاب ہوں اور کچھ سیاسی لین دین سے معاملہ دب جائے۔ ہمیں جس چیز کا خدشہ محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مولانا اپنی سیاسی تحریک میں کامیاب ہوں یا ناکام دونوں صورتوں میں دینی قوتوں پر کڑا وقت آ سکتا ہے اور دین کا بڑا نقصان ہونے کا خدشہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مولانا فضل الرحمن بہت زور اور قوت سے مارچ اور دھرنا دیتے ہیں جس کے نتیجے میں سول حکومت مفلوج ہو جاتی اور ناکام ہو جاتی ہے تو غالب امکان ہے کہ فوج امن و امان کی بحالی کے نام پر مارشل لاء لگا دے گی اور نہ صرف مولانا فضل الرحمن اور ان کی جمعیت کو کچلے گی بلکہ دوسری ساری دینی قوتوں پر بھی ہاتھ ڈالے گی تا کہ آئندہ کسی دینی قوت کو اس طرح کا حوصلہ نہ ہو، جس طرح کہ پشاور والے حملے کے بعد ہوا تھا۔

اور اگر مولانا فضل الرحمن اتنی بڑی قوت جمع نہ کر سکے کہ حکومت ختم ہو جائے لیکن وہ امن و امان کی صورت حال کو مخدوش بنانے میں کامیاب ہو گئے تو عمران خاں کی سِول حکومت فوج اور عدلیہ کی مدد سے ان کو کچل دے گی اور اس صورت میں بھی نزلہ صرف اُن پر اور ان کی جمعیت پر نہیں گرے گا بلکہ ساری دینی قوتوں پر گرے گا اور مدارس و مساجد کے علماء کی شامت

بھی آئے گی۔ یاد رہے کہ معاملات پہلے ہی اسٹیبلشمنٹ اور مغربی قوتوں کے خیال میں اتنے نازک ہیں کہ آرمی چیف خود ذاتی طور پر دینی مدارس کے نصابات وغیرہ بدلنے کے معاملات میں دلچسپی لے رہے ہیں اور اس سے پہلے ''پیغام پاکستان'' میں اسٹیبلشمنٹ سارے پاکستان کے علماء اور مفتیوں سے، خواہی نخواہی، اپنے موقف کے حق میں فتوے لے چکی ہے۔

اگر اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے مولانا کے مارچ اور دھرنے کو قوت سے کچلنے کا میدان سج گیا تو جمعیت کے کارکنوں اور ہمدردوں میں اس ''ظلم'' کے خلاف ردِّ عمل کے طور پر ''انتہا پسندی'' اور ''طالبانائیزیشن'' کا رجحان سامنے آ سکتا ہے جو ملک میں دینی قوتوں اور خصوصاً دیوبندی مدارس اور اداروں کے لیے ''امتحان'' کی صورت اختیار کر لے گا۔ اس لیے ہم پاکستان کی دینی قوتوں سے عموماً اور مولانا کے ہم مسلک مدارس و مساجد کی قیادت سے خصوصاً درخواست کریں گے کہ وہ محتاط رہیں اور آنے والے وقت کی سختیوں سے بچنے کی پیش بندی کریں ؎ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔

بقیہ: پاکستان میں جدید عصری تعلیم تباہی کے دہانے

اسلامی ریاست اور مہذب سماج میں تعلیم کبھی بھی برائے فروخت نہیں ہوتی۔ یہ بنیادی انسانی حق نہیں کہ صاحب حق اپنا حق معاف کر دے بلکہ تعلیم کا حصول ہر فرد کا فرض ہے، جو نہ چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ معاف ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ جب برصغیر میں مسلمانوں کے لیے تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے تو یہاں کے مسلم سماج نے اپنی مدد آپ کے تحت ایسے ادارے قائم کیے جو نہ صرف ضرورت مند طلبہ کی کفالت کرتے ہیں بلکہ انہیں کسی بھی قسم کی فیس کے بغیر زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں۔

ہم دینی مدارس کے قائدین سے گزارش کریں گے کہ ہمارے خیال میں پاکستان میں جامعات کا سارا انفراسٹرکچر اگلے دس سال میں دھڑام سے گر کر تباہ ہو جائے گا۔ سرکاری جامعات تو شاید تین چار سال بمشکل نکال سکیں۔ پرائیویٹ جامعات بھی اگر اپنی فیسوں میں قابل لحاظ کمی نہیں کریں گی تو اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکیں گی۔ یہ وقت ہے کہ دینی علم، اسلامی حمیت اور ادارہ جاتی تجربہ رکھنے والے افراد اور ادارے سامنے آئیں اور دینی مدارس کے پہلو بہ پہلو سائنسی، عمرانی، سماجی اور اقتصادی مضامین کی تعلیم کے لئے اسلامی فکر و تہذیب کی اساس پر ادارے قائم کریں اور اپنے اداروں کے توسط سے ساری ریاست کو مطلوبہ رخ دینے کی طرف پیش قدمی کریں۔

مدیر کے نام　　مدیر

کس قیامت کے یہ نامے

البرہان کے ستمبر ۲۰۱۹ء کے شمارے میں مدرسہ ڈسکورسز پر گفتگو کرتے ہوئے ضمناً جماعت اسلامی کے بعض دانشوروں کا بھی ذکر آ گیا تھا کہ وہ بھی مغربی فکر کے غلبے کی لہر سے متاثر ومرعوب ہو گئے تھے۔ اس پر ہمیں ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن کے نائب مدیر جناب پروفیسر سلیم منصور خالد صاحب کا طویل جذباتی خط ملا ہے جس میں انہوں نے مجھے خوب جلی کٹی سنائی ہیں اور میرے کردہ ناکردہ ''گناہوں'' کا ذکر کیا ہے، جس سے اندازہ ہوا کہ میرے مذکورہ چند جملوں سے انہیں بہت دکھ پہنچا جو ان کے اشتعال کا سبب بنا۔

ہم اہل برہان نے اس سال کے شروع میں یہ طے کیا تھا کہ ہم اپنے تئیں جماعت اسلامی کی محبت، خیر خواہی اور اسے کامیاب دیکھنے کی خواہش میں اصلاحی حوالے سے جو کچھ شائع کرتے ہیں، آئندہ اس سے احتراز کریں گے کیونکہ اہل جماعت اسے تنقید و تنقیص سمجھتے اور اس پر ناراض ہوتے ہیں۔

مدرسہ ڈسکورسز والا مضمون چھپنے سے پہلے برادرم پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کی نظروں سے بھی گزرا تھا اور انہوں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کہیں اور سے بھی اس پر کوئی ردّ عمل موصول نہیں ہوا۔ ہم برادر سلیم منصور خالد صاحب سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کی دل آزاری ہوئی اور ہماری تحریر سے ان کو دکھ پہنچا۔ ہم آئندہ مزید احتیاط کریں گے کہ ایسا نہ ہو۔

اسی طرح البرہان کے اکتوبر ۲۰۱۹ء کے شمارے میں دینی مدارس میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے تعلیمی نصاب کے حوالے سے جو شذرہ ہم نے لکھا تھا، جماعت اسلامی کی فکر رکھنے والے ایک دانشور، داعی اور معلم جناب محمد خاں منہاس صاحب (اسلام آباد) نے اس پر شدید تنقید کی ہے کہ ہم نے اس میں عقیدے کو شامل نہیں کیا اور سارا زور تزکیۂ نفس پر لگا دیا ہے۔ ہم نے الگ سے ایک شذرے میں اس کی وضاحت کر دی ہے جو اس شمارے میں موجود ہے۔ اللہ کرے اس سے ان کی تشفی کا کچھ سامان ہو جائے۔